تاریخ افکار و علوم اسلامی

بی ایس / ایم اے (علوم اسلامیہ)

کورس کوڈ :1906/2622

شعبہ فکر اسلامی، تاریخ و ثقافت

کلیہ عربی و علوم اسلامیہ

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

تاریخ افکار وعلوم اسلامی

بی ایس (علوم اسلامیہ)

کورس کوڈ : 1906

تالیف

پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

اشاعت اول:

تعداد اشاعت: 2000

کمپوزر:

تدوین: ڈاکٹر حافظ محمد سجاد، محمد یوسف یعقوب

طابع: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

ناشر: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

قیمت:

کورس ٹیم

چیئرمین	پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی ڈین کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ
تالیف وترتیب نو	پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی
نظر ثانی	پروفیسر شاہ عماد الدین پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الحق

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

فکرِ انسانی کی تاریخ میں علوم وافکار اسلامی کی حیثیت ایک درخشاں باب کی ہے۔ مذاہب عالم میں اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ اس کی اولین وحی علم کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کرتی ہے۔ سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو دوسری وحی نازل ہوئی اس میں بھی قلم اور تحریر کی قسم کھائی گئی ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ مسلمانوں نے علم کے حصول اور اس کی ترویج کو عبادت سمجھتے ہوئے اس میں حصہ لیا اور اس سلسلے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ علومِ شرعیہ کے علاوہ دنیاوی علوم میں بھی مسلم اہل علم نے جو شاندار کارنامے انجام دیے اس کی انسانی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ جس زمانے میں مسلمان علمی ترقی کے میدان میں ساری دنیا کی امامت کر رہے تھے، ان کی لائبریریاں لاکھوں کتب سے بھری پڑی تھیں اور مدارس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی تھی، اس وقت یورپ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، جہاں علم اور روشن خیالی کو کسی جرم سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مسلم علماء اور سائنس دانوں نے علمی ترقی کے لئے جو گراں قدر خدمات انجام دیں ان سے دنیا بھر نے استفادہ کیا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ بھی مسلمانوں کی علمی خدمات کی ہی مرہون منت ہے۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Breault) اس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

''یورپ کی حیات ثانیہ عربوں کی وجہ سے ہوئی۔ یورپ کی حیاتِ نو کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ سپین تھا۔ جس وقت یورپ جہالت و بربریت کے تاریک ترین گڑھوں میں گرا ہوا تھا۔ اس وقت بغداد، قرطبہ طلیطلہ، سے وہ تہذیب و تمدن نمودار ہو رہی تھی جس نے بعد میں انسانی ارتقاء کو ایک نئی صورت دی''۔

مغربی سامراج کے اثرات کی بناء پر امت مسلمہ آج فکری محکومیت اور ذہنی مرعوبیت کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کا رشتہ خود اپنی تاریخ اور اپنے عظیم الشان علمی ورثہ سے کمزور پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے آج کی نوجوان نسل کو اپنی کہانی بھی غیروں کی زبانی سننے کو ملتی ہے۔

امید ہے کہ طلباء اسلامی علوم وافکار اور ان کے ماخذ سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

زیرِ نظر کتاب "تاریخ افکار وعلوم اسلامی" کو بی ایس (علوم اسلامیہ) کے طلبہ وطالبات کی درسی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے از سرِ نو مرتب کیا گیا ہے۔

والسلام

پروفیسر ڈاکٹر محی الدین ہاشمی

ڈین کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ

کورس کا تعارف

زیر نظر کورس علامہ راغب الطباخ کی کتاب "تاریخ افکار علوم اسلامی" کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حسبِ ذیل کتب سے بھی مؤلفین کے شکریہ کے ساتھ استفادہ کیا گیا ہے۔

1. اردو دائرہ معارف اسلامیہ
2. التفسیر والمفسرون — محمد حسین ذہبی
3. ادب الاختلاف فی الاسلام — ڈاکٹر طہ جابر علوانی
4. علم الکلام اور الکلام — علامہ شبلی نعمانی
5. تدوین طبقات — ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی
6. مسلمانوں کے سائنسی کارنامے — ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی
7. قرون وسطی کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے — ڈاکٹر غلام قادر لون
8. ہندوستانی مسلمان — مولانا ابوالحسن علی ندوی
9. رسالہ آیات (علی گڑھ) — جنوری تا دسمبر 1997ء
10. (مضمون: سائنسی کتب۔ تراجم مترجمین) — ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی

زیرِ نظر کورس آپ کو مسلمانوں کے علمی اور سائنسی کارہائے نمایاں سے متعارف کرانے میں ممد و معاون ثابت ہوگا اور آپ کا علمی و نظریاتی رشتہ ان علمی و فکری اثاثوں سے قائم کرنے کی تحریک پیدا کرے گا جو دورِ عروج میں مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

طلبہ کی سہولت کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا کتب علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی لائبریری میں مہیا کی گئی ہیں۔ اگر طلبہ کو اپنے علاقوں میں یہ کتب ملنے میں دشواری کا سامنا ہو تو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، کی لائبریری سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

لازمی کتب برائے مطالعہ

1. تاریخ افکار وعلوم اسلامی — علامہ راغب الطباخ
2. مسلمانوں کے سائنسی کارنامے — ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی
3. ہندوستانی مسلمان — مولانا ابوالحسن علی ندوی

کورس کے مقاصد

ہمیں امید ہے کہ اس کورس کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. علم کے بارے میں مفکرینِ اسلام کے تصورات کی وضاحت کر سکیں اور واضح کر سکیں کہ تاریخ علوم میں مسلمانوں کا کیا مقام ہے۔
2. قرآن اور حدیث کی حفاظت اور تدوین کے مختلف ادوار پر روشنی ڈال سکیں اور ان کی تفسیر اور معنی و مفاہیم کے سمجھنے کے لئے وجود میں آنے والے علوم کا جائزہ لے سکیں۔
3. علم فقہ اور اصول فقہ کی تاریخ وتدوین پر بحث کر سکیں اور فقہاء کے درمیان اختلاف کے اسباب، ان کے فقہی اسالیب اور بنیادی کتب پر تبصرہ کر سکیں۔
4. تصوف اور علم کلام کی تاریخ، ارتقاء اور ان فنون پر صوفیاء و متکلمین کی خدمات اور ان کی اہم ابتدائی تالیفات کا تعارف کرا سکیں۔
5. اقتصادیات، سیاسیات اور عمرانیات پر مسلمان مفکرین کی آراء سے واقف ہوں اور ان کا مغربی مفکرین کی آراء سے تقابل کر سکیں۔
6. علم تاریخ وطبقات نگاری کے آغاز وارتقا کا جائزہ لے سکیں اور اس فن پر مسلمانوں کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈال سکیں۔
7. بیان کر سکیں کہ مسلمان یونانی علوم سے کس طرح متعارف ہوئے ان کے تراجم کی خصوصیات کیا تھیں نیز یہ کہ مسلمانوں نے ان تراجم سے کس حد تک استفادہ کیا؟
8. اسلام کے حوالے سے سائنسی علوم کی اہمیت سے آگاہ ہوں اور اس علم میں مسلمانوں کی تحقیقات وایجادات پر سیر حاصل گفتگو کر سکیں۔

فہرست عنوانات

یونٹ نمبر	نام یونٹ	صفحہ نمبر
1	اسلام کا تصوّرِ علم اور تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام	2
2	قرآن، علوم القرآن اور علم تفسیر	34
3	علوم الحدیث، سیرت و مغازی	59
4	اصولِ فقہ اور فقہ	89
5	علم الکلام	111
6	تصوّف	129
7	اقتصادیات، سیاسیات، عمرانیات	139
8	علم تاریخ و طبقات نگاری	167
9	سائنسی علوم	183

یونٹ نمبر 1

اسلام کا تصوّرِ علم اور تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 3

یونٹ کے مقاصد 4

1- علم کی تعریف 5

1.1- تعریفوں کی کثرت کا سبب 5

2- علم کے مختلف تصورات 6

2.1- علم، قرآن مجید کی رُو سے 6

2.2- علم، حدیث کی رُو سے 8

2.3- علم کی تقابلی فضیلت کے بارے میں محدثین کی رائے 9

2.4- فقہاء اور متکلمین کی رائے 10

2.5- علم کے بارے میں صوفیاء کے خیالات 11

3- مسلمانوں کے قدیم علمی نظریے کی خصوصیات 13

4- اسلام سے پہلے دنیا کے علوم 14

5- تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام 15

خود آزمائی نمبر 1 17

6- برصغیر پاک و ہند میں تاریخ افکار و علوم اسلامی 17

7- برصغیر کے مسلمانوں کے علمی کارنامے 19

7.1- فن حدیث کی خدمت 22

7.2 - برصغیر کے صوفیاء کرام اور معاشرہ پر ان کے اثرات 23

خود آزمائی نمبر 2 28

یونٹ کا تعارف

عقیدہ توحید نے کائنات کے بارے میں انسان کی سوچ اور رویے میں بنیادی تبدیلی پیدا کی۔ کل جن مظاہرِ فطرت اور اشیاءِ کائنات کی وہ پرستش کرتے تھے آج انہیں اپنا خادم سمجھنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام نے اپنی دعوت کا آغاز حصولِ علم کی ترغیب اور تحقیق کی حوصلہ افزائی سے کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی سیاسی قوت میں اضافے کے پہلو بہ پہلو ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں روز بروز تیز تر ہوتی گئیں۔ رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کی بدولت کہ

الْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ، حَيْثُمَا وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا [1]

"حکمت کی بات مؤمن کی متاعِ گم گشتہ ہے جہاں سے بھی ملے وہی اس کا حقدار ہے۔"

مسلمان اس قدر سرگرمی اور تن دہی سے علم و حکمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے کہ انسانی تاریخ میں اس نوع کی ہمہ جہت سرگرمیوں کا اور کہیں سراغ نہیں ملتا۔

برصغیر کی تاریخ کا اسلامی زمانہ گیارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اور اٹھارویں صدی تک ختم ہوتا ہے۔ اس سات سو سال کے عرصے میں مختلف فاتحین نے اس ملک کو زیر کیا، جن میں عرب، افغان، ترک اور مغل شامل ہیں۔ ان سب فاتحین کا مذہب اسلام تھا اور ان کے کل نظامات شریعت محمدیہ پر مبنی تھے۔ ان فاتحین نے نہ صرف ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اپنا مذہب، اپنی زبان، اپنی صنعت اور علوم و فنون اور ادب کا مذاق بھی ساتھ لائے۔ احمد آباد، آگرہ، دہلی، بیجاپور وغیرہ جیسے مغلوں کے قدیم دارالحکومتوں کی عمارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے صنعت کو کس درجہ ترقی دی تھی نیز ان بادشاہوں کی سوانح عمریوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم و ادب کے اعلیٰ درجے کے سرپرست تھے۔ اس دور میں علماء و فضلاء نہ صرف بڑے شہروں اور دارالحکومتوں میں جمع تھے بلکہ تمام ملک میں اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

---

[1] (سنن ابن ماجہ (2/ 1395)

زیر نظر یونٹ میں آپ ''علم'' کے بارے میں مختلف تصورات اور اس کی اقسام کے بارے میں پڑھیں گے اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ اسلام سے قبل دنیا میں علم کا کیا مقام تھا اور مسلمانوں نے تحصیل واشاعتِ علوم میں کیا کارنامے سرانجام دیے۔ علاوہ ازیں برصغیر میں اسلامی تہذیب وتمدن کی ترقی میں صوفیاء نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، برصغیر میں اسلام کی اشاعت بھی زیادہ تر انہی کے ہاتھوں ہوئی۔

یونٹ کے مقاصد

ہمیں امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1۔ قرآن وسُنت کے حوالے سے علم کی اہمیت بیان کر سکیں۔

2۔ علم کے بارے میں محدثین، فقہاء، متکلمین اور صوفیاء کے خیالات کی وضاحت کر سکیں۔

3۔ تاریخِ علوم میں مسلمانوں کے مقام اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں مسلمانوں کی علمی تحریک کے اثرات کا جائزہ لے سکیں۔

4۔ برصغیر میں مسلمانوں کے نظام تعلیم پر گفتگو کر سکیں۔

5۔ برصغیر کے علماء کے علمی کارناموں اور صوفیاء کی خدمات وافکار پر بحث کر سکیں۔

1- علم کی تعریف

لُغت میں علم کسی شے کی حقیقت کے ادراک کا نام ہے۔ اسلامی ادبیات میں علم کے مختلف معنی آتے ہیں۔ قرآن مجید میں علم کے ساتھ حکمۃ کی اصطلاح بھی آئی ہے علم کے مرادفات میں ادراک، شُعور اور معرفت جیسے الفاظ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ محدود مفہوم میں فن اور صناعت کو بھی علم کے معنی میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔

علماء نے علم کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا جائزہ حسبِ ذیل ہے۔

مواقف میں ہے کہ علم ایک صفت ہے جس کے ذریعے کسی شے کا ادراک حاصل ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ ایک ذہنی عمل ہے۔

علامہ اشعری لکھتے ہیں کہ علم خدا کے وجود اور حقیقت کی شہادت ہے۔ علم بدیہی بھی ہے اور اکتساب بھی۔ علم کشف سر ہے جو نفس کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ صوفیا کے نزدیک علم تجلی ہے اور کلیات کی بصیرت کا نام ہے۔ یہ ایک نور ہے جو خدا کی طرف سے دل پر ڈالا جاتا ہے۔

علم کی بے شمار تعریفوں کے باوجود اس کی صحیح اور قطعی تعریف نہیں ہو سکتی چنانچہ امام غزالیؒ نے المستصفی میں اور الآمدی نے ابکار اور احکام میں علم کی قطعی تعریف پیش کرنے سے احتراز کیا ہے البتہ ان کے بقول تعریف کے بجائے مثال اور تجزیے سے علم کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

1.1- تعریفوں کی کثرت کا سبب

علم کی تعریفوں کی اس کثرت کا سبب نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہے۔ کہیں متکلمین کا، کہیں منطقیوں کا، کہیں حکماء کا، کہیں صوفیاء کا۔ صرف علم کی ماہیت ہی کے بارے میں اٹھائے گئے سوالات کو دیکھا جائے تو کثرتِ تعریفات کی علت سمجھ میں آ جاتی ہے، مثلاً یہ کہ کیا علم کا وجود ذہن میں مستلزم ہے۔ (جیسا کہ حکماء خیال کرتے ہیں) یا یہ ذہن میں عالم و معلوم کے تعلق کا نام ہے (جیسا کے متکلمین کا خیال ہے)۔

اس قسم کے اختلافات کی وجہ سے علم کی تعریف بکثرت ظہور میں آگئیں اور ان تعریفوں کی روشنی میں علم کی اقسام میں بھی کثرت آگئی۔

2- علم کے مختلف تصورات

2.1- علم، قرآن مجید کی رُو سے

قرآن مجید میں لفظِ علم مختلف اشتقاقی صورتوں میں 778 مرتبہ وارد ہوا ہے۔ ان مواقع پر علم کی دو شکلوں کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔ اول وہ علم جو ذاتِ باری کی صفتِ خاص ہے۔ دوم وہ علم جو مخلوق خصوصاً انسان کو عطا ہوا ہے۔

قرآن مجید میں اس مادے کے اشتقاقات جس کثرت سے آئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ قرآن مجید کی رُو سے علم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جب یہ لفظ جزوی ترادف کے ساتھ دوسرے مرادفات (مثلاً تَعْقِلُون، یَتَدَبَّرُون، تَفْقَهُون وغیرہ) کے ساتھ مل کر یا اس کی جگہ آتا ہے تو ان سے علم کے طریقوں، غایتوں اور جہتوں کا پتہ چلتا ہے۔ مغربی حکماء بڑے زمانے تک یہی باور کراتے رہے کہ انسانی علم کے بارے میں اسلام کا رویہ محض نظری اور داخلی ہے۔ یعنی عملی و تجربی (Empirical) نہیں لیکن یہ خیال درست نہیں۔ اسلام میں علم کی بڑی غایت جہاں معرفت ذات وصفات باری ہے وہاں فلاح و خیر انسانی بھی ہے۔ اس کا مقصد افادہ ہے۔ یہ تصور قرآن مجید کی آیات سے مترشح ہوتا ہے مگر اس کی اساسیات محض مادی نہیں۔ مغرب کے فلسفہ ، عملیت یا نتائجیت (Pragmatism) کے برعکس اس میں مساوی نتائج کے علاوہ روحانی نفع اور آخرت کی فلاح بھی شامل ہے۔ یہ قرآن مجید ہی کے اثباتی اور مشاہداتی رجحان کا نتیجہ تھا کہ تاریک دور کے خالص داخلی تصور علم کے بعد یورپ میں پہلے ذوقِ مشاہدہ و تحقیق اور پھر ذوقِ تجزیہ پیدا ہوا۔

اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ مسلمانوں میں علم کی تحریک قرآن مجید سے پیدا ہوئی اور وہ انہیں راستوں پر آگے بڑھی جو مسلمانوں نے مطالعۂ قرآن اور احکام الٰہی کی پیروی میں اختیار کیے۔ چنانچہ دینی علم کے علاوہ مختلف دوسرے علوم مثلاً جغرافیہ، تاریخ، رِجال، نظری و تجربی علم، مثلاً سائنس و ریاضیات، نیز علم الاشیاء جیسے طبیعات و

فلکیات وغیرہ اسی رہنمائی کی رہین منت ہیں۔ قرآن مجید میں علم کی غایتوں اور وسعتوں کا جو ذکر ہے۔ اس کے زیر اثر علم کی چند بڑی نوعیتیں معین ہوئی ہیں:

1۔ علم کی وسعت:

خدا کی صفت واسع علیم ہے۔ اس تصور کی تحریک سے مسلمانوں کے یہاں دائرۂ علمی وسعت پذیر ہوا اور انسان بھی اپنے اخلاق کے سرچشمۂ علم سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے پر مائل ہوا ہے۔

2۔ یقین کی دولت:

مسلمانوں نے یقین اور ظن میں فرق کیا اور ظن و تخمین کی حوصلہ شکنی کی۔ اہل فکر کا ایک گروہ شک (Doubt) کو علمی ترقی کی بنیاد مانتا ہے۔ جو کہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ دراصل وہ شک جو یقینی حقیقتوں کے بارے میں کیا جاتا ہے، مجہولیت اور لایعنیت پر ختم ہو جاتا ہے۔ جس طرح یقینی سائنسی تجربے پر شک نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح یقینی روحانی تجربوں پر بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔ الہامی واردات بھی قطعی ہیں، البتہ مادیت کے نادیدہ خواص کے بارے میں شک کرنے سے تحقیق و تلقین کی ضرورت پڑتی ہے، ایسے شک سے یقین کا حصول ممکن ہوتا ہے، جو علم یقین نہیں پیدا کر سکتا وہ انتشار کا موجب ہوگا اور اس سے سکونِ قلب پیدا نہیں ہو سکتا۔

3۔ مشاہدہ و تجزیہ:

اللہ کی قدرت کی نشانیاں کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے مشاہدہ و تجزیہ پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ نے برّ و بحر اور زمین و آسمان کے حقائق کا مطالعہ و تحقیق کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔

4۔ تدبُّر:

تفکر کے ساتھ تدبر پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تدبر، تفکر کی تنظیم کا نام ہے، اس تنظیم کے بغیر تفکر کی تکمیل نہیں ہوتی۔

5۔ علم و عمل:

قرآن مجید میں علم اور عمل کو لازم و ملزم قرار دیا گیا ہے اور علم کے ساتھ حکمت کا تذکرہ کر کے علم کی ان منزلوں

کی نشاندہی کی گئی ہے جن کا تعلق حقائقِ عالیہ اور زندگی و معاشرے کی عملی تنظیم سے ہے۔

6۔ نظریہ علم کی کلیت:

علم کو انسان کے ظاہر و باطن اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے مفید اور سود مند قرار دیا گیا جس سے اسلام کے نظریہ علم میں کلیت پیدا ہو گئی ہے۔ اسلام کلی حقیقتوں پر یقین رکھتا ہے زندگی کو جزوی طور پر دیکھنے کا قائل نہیں۔

غرض جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے، علمِ انسانی سے مراد محض تصور ہی نہیں، اس کی تصدیق بھی اس میں شامل ہے۔ حواس سے محسوس کرنے کے بعد اسے پرکھنا تجزیہ کرنا، حقیقت تک رسائی حاصل کرنا اور اس پر عمل کر کے اسے سعادتِ دارین کا حصہ بنانا اصلی مقصد ہے۔

2.2- علم، حدیث کی رُو سے

قرآن مجید کے بعد رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا درجہ ہے جو قرآن کی تشریح و تفسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ کُتبِ حدیث میں علم کی اہمیت و فضیلت پر وافر مواد موجود ہے۔ احادیث میں حکماء کی فلسفیانہ اور متکلمین کی استدلالی تعریفات موجود نہیں تاہم ان میں علم کے جملہ عملی مقاصد و غایات کے اصول آ گئے ہیں اور باضابطہ علوم کی سمت نمائی بھی ہے۔ بہر کیف ان میں علم سے مراد بدرجہ اول قرآن مجید اور احادیث رسول کی روایت و حفاظت کا علم ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں علم کی دوسری شاخیں بلکہ حقائقِ کائنات، مشاہدات اور صانع حقیقی کی صنعتوں کے علم کی طرف اشارے اور ان کے مطالعے کی ترغیب ملتی ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا کی سب سے بڑی علمی تحریک دورِ اسلامی میں پیدا ہوئی۔ احادیث میں باب العلم کی تدوین نے ایک طرف علم و حدیث کے مختلف طریقوں اور ان کی حفاظت کی ضرورت کے لیے ایک اصول کار متعین کیا اور دوسری طرف یہ رہنمائی بھی کر دی کہ قرآن مجید کو حدیث ہی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے اسی طرح حدیث ہی کی رہنمائی سے علوم و معارف کا استخراج ہوا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے اسی طرح حدیث ہی کی رہنمائی سے علم و معارف کا استخراج ہوا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن مجید کے زیر اثر اور روایت حدیث کی جستجو نے مسلمانوں کے کئی اور علوم و فنون کی راہیں کھول دیں۔ رِجال، سیر، علم معرفت شخصیت، تاریخ، جغرافیہ، علم الانساب والقبائل، علم درایت و فقہ و کلام، سیاحت و سفر بلکہ خود ایجاد، اکتساب و

انکشاف کا ذوق، یہ علوم قرآن و حدیث کے رہینِ منت ہیں۔

2.3- علم کی تقابلی فضیلت کے بارے میں محدثین کی رائے

محدثین کے نزدیک علوم کی تقابلی فضیلت کی تفصیل میں تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ اسحاق بن راھویہ کے نزدیک علم کا مطلب یہ ہے کہ وضو، نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ ضروریات دین کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ امام مالک نے فرمایا کہ آدمی کو اتنا علم ضرور حاصل کرنا چاہیے کہ اپنے دین سے فائدہ اٹھا سکے سفیان بن عینہ کہتے ہیں کہ تحصیل علم اور جہاد مسلمانوں کی جماعت پر فرض کفایہ ہے جسے اگر ایک گروہ بھی ادا کر دے تو باقی لوگ سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک علوم کی دو قسمیں ہیں، فرض عین اور فرض کفایہ۔ دین کے فرائض کا اجمالی علم، فرض عین ہے جس کا حصول ہر ایک کے لئے لازمی ہے۔ اس علم میں اللہ تعالی کی ذات اور جملہ صفات پر ایمان کامل رکھنے کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کو اللہ کا آخری رسول اور قرآن مجید کو آخری آسمانی کتاب ماننے کا اعلان ہے موت کے بعد حشر، جزاو سزا، جنت اور دوزخ کا اقرار بھی ضروری ہے۔ یہ جاننا بھی لازم ہے کہ رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں اور ان باتوں کا علم بھی ضروری ہے جن کے بغیر نماز پوری نہیں ہوتی۔ مثلاً طہارت، نماز کے ارکان واحکام اور یہ کہ رمضان کے روزے فرض ہیں اور روزے کے احکام کا علم زکوۃ کا نصاب اور اس کے احکام اس طرح حج کے احکام اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حلال و حرام چیزوں کا علم بھی ضروری ہے۔

دوسرے علوم تحصیل اور ان میں مہارت محدثین کے نزدیک فرض کفایہ ہے۔ ایسے علم کو اگر ایک فرد بھی حاصل کرلے اور باقی کسی وجہ سے نہ بھی کریں یا نہ کر سکیں تو لوگ گنہگار نہ ہوں گے مگر سب کریں تو یہ سعادت ہے۔ جعفر بن محمد کے نزدیک علم چار باتوں میں محصور ہے۔

1. اللہ تعالی کی معرفت
2. اس کے احسانات کی معرفت
3. اس کے احکام کی معرفت
4. ان امور کا علم جن سے انسان دین سے نکل جاتا ہے۔

2.4-فقہاءاور متکلمین کی رائے

متکلمین نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں، علم قدیم اور علم حادث۔ علم قدیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو قائم بالذات اور اللہ تعالیٰ کی صفت واجب ہے۔ یہ غیر متناہی معلومات پر مشتمل اور تمام موجودات پر محیط ہے۔ اس علم پر ضروری یا اکتسابی وغیرہ کی تعریفات کا اطلاق بھی نہیں کیا جا سکتا۔

علم حادث کا تعلق مخلوق سے ہے جس کی دو قسمیں ہیں:

ایک ضروری یا بدیہی: جس کے حصول میں انسان کو اپنی قدرت و طاقت صرف نہ کرنی پڑے۔ جیسے محسوسات کا علم (آگ کا گرم ہونا وغیرہ) علمِ حادث کی دوسری قسم علمِ نظری یا کسبی ہے جو محنت واکتساب سے حاصل ہوتا ہے۔ علمِ ضروری یا بدیہی ہر انسان کی حاجت وضرورت ہے جس کے بغیر وہ ضرر سے دوچار ہو سکتا ہے۔ جیسے یہ جاننا کہ آگ گرم ہوتی ہے اور جلا دیتی ہے، یا مثلاً یہ جاننا کہ اجتماعِ ضدین محال ہے، جیسے رات اور دن یا روشنی اور تاریکی کا جمع ہونا محال ہے۔ علم ضروری کے برخلاف علم نظری یا اکتسابی کا عدمِ حصول لازماً ضرر کا باعث نہیں ہوتا۔

علمِ باری تعالیٰ کے بارے میں امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ ازلی ہے۔ علیم ہونا اللہ تعالیٰ کی اسی طرح قدیم اور ازلی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ ازل میں بھی اشیاء کو ان کے وجود میں آنے سے قبل جانتا تھا اور وہی ان اشیاء کی قضاء وقدر کا مالک ہے۔ دنیا اور آخرت میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی مشیت، علم قضا وقدر سے ہوتا ہے اور ہر چیز اللہ نے لوح محفوظ میں لکھ دی ہے۔

امام نسفی کے نزدیک علم خدا کی صفاتِ کمال میں سے ہے۔ قدرت کی طرح اللہ تعالیٰ کا علم بھی ازلی اور واجب الوجود ہے۔

معتزلہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے علیم وقدیر ہے مگر اس کا علم وقدرت گوشت پوست کے انسان کے علم وقدرت کی طرح نہیں بلکہ اللہ سے علم کی نسبت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی ذات سے جہل کی نفی کر دی جائے۔

علم کے سلسلے میں علم عقائد اور علم کلام میں ایک اور نقطہ نظر سے بھی بحث ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں علم کہتے ہیں اس بحث کا تعلق دراصل ایمان واسلام کی حقیقت سے ہے۔ اس بحث کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ ہے

کہ آیا اللہ کی ذات کے بارے میں انسان کو علم حاصل ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایمان کی ماہیت کیا ہے اور اس کا علم و معرفت سے کیا رشتہ ہے۔

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو ممکنات و موجودات کا صانع ہے، اس کی ذات کا علم حاصل کرنا انسان کے لئے ممکن اور ثابت ہے اور وہ اس طرح کہ تمام موجودات و ممکنات حادث اور مخلوق ہیں، جن کو پیدا کرنے والا ضرور ہونا چاہیے لہذا موجودات اپنے خالق کی ذات کا پتہ دیتی ہیں اور انہی کے ذریعے ہمیں اللہ کی ذات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

ایمان اور علم کے باہمی تعلق کا دار و مدار اس کی تعریف پر ہے بعض کے نزدیک ایمان صرف اقرار باللسان کا نام ہے۔ مثلاً کرامیہ کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی زبان سے ایمان کا اقرار کرے تو وہ مومن ہے خواہ دل میں وہ کفر و اعتقاد ہی رکھتا ہو۔ کرامیہ کے نزدیک علم و معرفت کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے برعکس جہمیہ کا عقیدہ ہے کہ ایمان محض اللہ کی ذات کے علم و معرفت کا نام ہے یا دوسرے لفظوں میں ایمان اور علم لازم و ملزوم ہیں۔ اقرار باللسان اور عمل بالجوارح کا علم سے کوئی تعلق نہیں ان کے نزدیک اللہ کو نہ جاننا بھی کفر ہے۔

امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک ایمان نام ہے اقرار باللسان کا اور معرفت و تصدیق کے ساتھ عمل بالجوارح بھی ضروری ہے۔

2.5- علم کے بارے میں صوفیاء کے خیالات

علم الٰہی اور علم انسانی کے بارے میں صوفیاء نے اپنے اپنے انداز میں کچھ مشترک اور کچھ مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بعض صوفیاء متکلمین کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں، بعض علماء اشراقیوں کی، بعض نے شطحیہ انداز میں گفتگو کی ہے اور بعض نے رمزیہ عبارتوں میں۔ صوفیاء کی مقبول عام اصطلاح معرفت ہے۔ تاہم ان کی کتابوں میں علم کی اصطلاح بھی آتی ہے۔ معرفت کا مطلب اللہ تعالیٰ کو پہچاننا ہے اس کے دوسرے معنی حقیقت کی دریافت یا کائنات اور انسان اور دوسری اشیاء کی باطنی حقیقت کا ادراک ہے۔ معرفت وہ علم ہے جس کا حقیقی منبع وجدان یا الہام ہے جو ایک داخلی ذریعہ ہے۔ بایں ہمہ صوفیاء علم کے چشموں کا انکار نہیں کرتے۔

ذیل میں چند صاحب تصنیف اکابر صوفیاء کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

الجوہری کے نزدیک علم دو ہیں:

1. اللہ تعالی کا علم
2. مخلوق کا علم

اللہ تعالی کا علم لا متناہی ہے اور وہ موجودات و معلومات ہر شے کو محیط ہے۔اس کے مقابلے میں انسانی علم محدود ہے۔ مخلوق کا علم جو اللہ تعالی کے امور اور اس کی معرفت سے متعلق ہے، دو طرح کا ہے:

ایک ظاہر اور دوسرا باطن، دونوں باہم پیوستہ ہیں۔

یہ دونوں سلسلے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ان علوم کو بے منفعت کہا گیا ہے جو علم والے کو عمل سے دور رکھے۔

علم کے بارے میں ابن العربی کے خیالات ان رمزوں اور علامتوں کے حوالے سے بیان کیے جا سکتے ہیں جو ان کی خصوصیات اور انہی کی ایجاد ہیں۔ جنہیں انہوں نے اپنے کمال سے علامتی ہونے کے باوجود قابل قبول بلکہ مقبول بنا کر پیش کیا ہے۔ابن العربی کا سب سے بڑا صوفیانہ عقیدہ وحدت الوجود ہے جس کا علمی طریق کار تاویل ہے۔ابن العربی کا خیال ہے کہ دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے حقیقت میں وہ نہیں جو نظر آتا ہے بلکہ وہ ہے جو اس ظاہر کے باطن میں ہے۔

ظاہر ہے اس خصوصی تفہیم کی روشنی میں ابن العربی کا نظریہ باطنی مفہوم پر مشتمل ہے جس کے لئے وہ کبھی فلسفیانہ اور کبھی رمزی زبان استعمال کرتے ہیں۔ علم کا تصور ان کے یہاں عقلی نہیں بلکہ جذباتی اور نفسیاتی ہے۔ان کے نزدیک علم در حقیقت باطن کے انعکاس کا وجدان ہے۔

شہاب الدین سہروردی نے اپنی کتابوں میں اکتساب علم کے چار مراتب شمار کیے ہیں۔

1. رسمی طلب علم والے (علماء ظاہر)
2. رسمی علم کے ساتھ عقلی استدلال والے (مثلاً الفارابی اور ابن سینا)
3. استدلال عقلی سے بے نیاز (عقلی، الہامی اور اشراق باطن حاصل کرنے والے مثلاً الحلاج، بسطامی، تستری وغیرہ)

4. جو استدلال عقلی میں بھی کامل ہیں اور انہوں نے اشراق کو بھی تسلیم کیا ہے (یہ حکمائے متالھین ہیں، ان میں سہروردی نے اپنے علاوہ فیثا غورث اور افلاطون کا بھی ذکر کیا ہے۔)

3- مسلمانوں کے قدیم علمی نظریے کی خصوصیات

گزشتہ صفحات میں آپ نے مطالعہ کیا ہو گا کہ مسلمانوں کا تصور علم قرآن مجید کے اثرات کا رہین منت ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالی کی ذات وصفات محدود نہیں ہیں جب کہ انسان کا علم محدود ہے۔ انسان خدا کی معرفت اور اس کی حکمتوں اور اس کی قدرت کے شواہد اس کی نشانیوں سے حاصل کر سکتا ہے۔ جہاں خدا کی وجدانی جستجو سلوک اور معرفت سے ممکن ہے وہاں خدا کی صفات کا علم مشاہدے سے اور اس کی حکمتوں کا علم تحقیق و تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کی رو سے علم کلیات کا حامل ہے یعنی انسان کو حواس، مشاہدہ، تخیل، تعقل و تجربہ اور کشف والہام سب طریقوں کے اجتماع سے علم حاصل ہو سکتا ہے۔ صرف حواس، صرف عقل یا صرف تجربہ کافی نہیں۔

علم کا ایک راستہ الہام بھی ہے جسے وجدان یا تلقی بالغیب بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا منبع روح اور وہ برتر قوتیں ہیں جو عالم ارواح سے وابستہ ہیں۔

علم کا ایک ذریعہ رویائے صادقہ (سچے خواب) بھی ہیں۔ قرآن مجید کی روح سے انسانی علم۔ معرفت خداوندی کے علاوہ ایک مقصد سلسلۂ عمل بھی ہے۔ علم کا ایک مقصد خدا کی معرفت اور دوسرا مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ ایک اور مقصد مشاہدہ کائنات اور تحقیق و جستجوئے اشیاء اور خدا کی حکمتوں کی دریافت ہے۔ تذکیر بآلاءاللہ، تذکیر بآیات اللہ اور تذکر بایام اللہ بھی علم صحیح کا ایک مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ان کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔

4- اسلام سے پہلے دنیا کے علوم

اسلام سے پہلے چین، ہندوستان، مصر، بابل، اشوریا، یونان اور روما علم کے مراکز مانے جاتے تھے مگر یہ واقعہ ہے کہ یونان کے علاوہ باقی ملکوں کے علوم کو علوم کہنا خود علم کی ناانصافی کرنا ہے۔

بابل، اشوریا اور مصر کے علوم زیادہ تر خرافات ، توہمات، اور جادو کا مجموعہ تھے۔ چین اور ہندوستان بھی سحر و طلسم کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چین نے اخلاقیات میں اور ہندوستان نے الٰہیات، ہیئت اور طب میں کچھ قدم آگے بڑھائے تھے۔ روما کا رشتہ علم سے برائے نام رہا۔ یونان میں بلاشبہ بلند پایہ علماء اور فلاسفہ پیدا ہوئے اور انہوں نے انسانی ذہن و دماغ کے لئے نہایت قیمتی مواد بھی بہم پہنچایا۔ اصل یونان تمام پیش رو متمدن ملکوں کے علوم کا لائق وارث تھا، خاص طور پر مصر، بابل، اشوریا کے علوم اسی کو منتقل ہو گئے تھے۔ اسی لئے قدیم علمی دنیا میں یونان آفتاب بن کر چمکا۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے عقلی علوم کا سرچشمہ بھی یونان ہی بنا۔ مگر یونان میں علم کا دائرہ مدتوں چند افراد میں محدود رہا اور جب وسعت پیدا ہوئی تو علم کی جگہ ایک قسم کی ذہنی عیاشی نے لے لی۔ یونان کے حکماء اور فلاسفہ لائق تعظیم سہی مگر اس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرف سے یونان میں بھی علم نہ کبھی عام ہوا نہ روزمرہ کی زندگی میں کبھی انسان کا رہنما بن سکا۔

قدیم دنیا میں علم کے عام نہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ تحریر و کتابت کو ہر ملک میں خاص گروہ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا اور دوسروں پر اس کا دروازہ بند تھا۔ مصر کا ہیرو گلیفی خط، بابل کا میخی خط، اور چین کا طلسماتی خط عام نہ تھے۔ چند افراد جو ایک خاندان یا ایک طبقے کے ہوتے تھے، اسے جانتے اور برتتے تھے، علم سینہ بہ سینہ چلتا تھا۔ کتابیں لکھی نہیں جاتی تھیں یاد کر لی جاتی تھیں اور یاد کرا دی جاتی تھیں کیونکہ علم خاص خاص طبقوں کی میراث تھا اور دوسروں میں اس کی اشاعت ممنوع تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ علم تھا، چند نفوس میں محصور ہو کر رہ گیا اور ایک قسم کا طلسمی راز بن گیا تھا۔

5- تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام

مذاہب عالم میں اسلام وہ واحد دین ہے جس کا آغاز ایک ایسے پاکیزہ لفظ سے ہوا ہے جو دین و مذہب، علم و فن اور تہذیب و تمدن کی اساس ہے۔

سورہ علق کی پانچ آیتوں کے بعد رسول اللہ ﷺ پر جو دوسری وحی نازل ہوئی اس میں بھی قلم اور تحریر کا بیان ہے۔ سورہ قلم میں اللہ تعالی نے آلہ تحریر اور عمل تحریر دونوں کی قسم کھائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

{ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ } [2]

ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی علم کی اشاعت کے لئے جو مساعی کیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ جنگ بدر میں گرفتار کئے گئے قیدیوں سے فدیہ لینا طے ہوا۔ قیدیوں میں سے کچھ لوگ زر فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ ان لوگوں سے یہ کہا گیا کہ وہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں اور رہا ہو کر واپس چلے جائیں۔ ان لوگوں نے یہ شرط قبول کر لی۔ جنگی اور سیاسی حکمت عملی کو مد نظر رکھا جائے تو یہ اقدام کسی طرح خطرات سے خالی نہیں تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے تھے، جنگ ہار گئے تھے اور انہیں تعلیم دینے کی ذمہ داری سونپنا خطرے کی دعوت دینا تھا لیکن علم ایسی نعمت ہے کہ اس کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ بھی مول لیا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ نے علم کو عادت سمجھ کر اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا اور اس سلسلے میں دور دراز کے سفر کئے۔ ان کے شوق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے صرف ایک حدیث سننے کے لئے ایک ماہ کا طویل سفر طے کیا تھا۔ یہ تنہا ایک واقعہ نہیں بلکہ احادیث و آثار کا علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا خلاف راشدہ اور اس کے بعد والے ادوار میں ایک معمول بن گیا تھا۔

علوم شرعیہ کی نشر و اشاعت میں مسلمانوں نے جس جانفشانی، عرق ریزی اور دیدہ دری کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے مگر یہ ان کا دینی فریضہ تھا اور جس کی پشت پر خدمت دین کا جذبہ بھی کار فرما تھا۔ اجر و ثواب اور رضائے الٰہی

---

[2] [القلم: 1]

کو مد نظر رکھ کر اگر مسلمان علوم شرعیہ کی خدمت کرنے میں تن من کی بازی لگاتا ہے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے دنیاوی علوم میں بھی اسی دیدہ دری، تحقیق و تفتیش اور ذمہ داری کا ثبوت دیا جو علوم دینیہ کے لئے خاص تھی۔ تاریخ، جغرافیہ، حیاتیات، کیمیا، طبعیات، طب، ہیئت اور ریاضی جیسے علوم میں مسلمانوں کے شاندار کارناموں کو پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

جس زمانے میں مسلمان علمی ترقی کی معراج پر تھے، ان کی لائبریریاں لاکھوں کتابوں سے بھری پڑی تھیں، لیبارٹریوں میں سائنسدان دن رات تجربات میں مگن رہتے تھے اور مدارس میں طلبہ کی کثرت کی وجہ سے تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور علم و تعلم کا نام لینا بھی وہاں جرم سمجھا جاتا تھا۔ کتابوں سے دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے جس شہر پر بھی قابض ہوئے وہاں کی تمام لائبریریوں کو جلاڈالا۔

مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں اندلس پہنچے اور سو سال بعد سسلی میں وارد ہوئے، یہ اپنے ساتھ تاریخ، فلسفہ، طبعیات، طب، ریاضی، شعر و ادب، علم کلام اور دیگر درجنوں علوم لے کر گئے تھے۔ خلافت اندلس میں غیر مسلموں کو پوری علمی آزادی حاصل تھی۔ یورپ کے تمام ممالک سے طالبان علم عربوں کے علمی مراکز کا رخ کرتے تھے اور وہاں آکر مسلمانوں کی علمی فیاضیوں سے مستفید ہوتے تھے صقلیہ میں نارمنوں اور فریڈرک دوم اور اس کے جانشینوں نے مختلف علوم و فنون (فلسفہ، سائنس اور طب) کی کتابیں لاطینی زبان میں بکثرت ترجمہ کرائیں، یورپ میں اندلس کے اسلامی علوم و فنون کی اشاعت بھی فریڈرک کے واسطے سے اطالیہ اور صقلیہ کی راہ سے ہوئی اور فلسفہ و طب کے علاوہ دیگر علوم کی کتابیں بھی لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ ان کتابوں کے بیشتر مترجم یہودی علماء تھے جنہوں نے یورپ کے ثقافتی ارتقاء میں بھرپور حصہ لیا اور اسلامی ثقافت کو یورپ کے دور دراز اور نیم مہذب علاقوں تک پہنچایا۔ عربی کتابوں کے عبرانی اور لاطنی تراجم یورپ کے لئے سرچشمۂ رحمت ثابت ہوئے۔ فرانسیسی اور جرمن راہبوں نے علوم کی درسی کتب یہودی فضلاء سے پڑھیں۔ ولیم آف نارمنڈی کے ساتھ بے شمار یہودی فضلاء انگلستان آئے، جہاں آکسفورڈ میں ان کے ہاتھوں پہلا مدرسہ قائم ہوا۔ اسی سکول سے راجر بیکن Roger Bacon(1214ء تا1239ء) نے عربی زبان اور علوم حکمیہ حاصل کئے۔ کہا جاتا ہے کہ مغرب میں تجربی علوم کا سہرا راجر بیکن کے سر ہے۔ مسیحی یورپ نے مسلمانوں کے علوم راجر بیکن سے سیکھے جس نے خود آکسفورڈ کے علاوہ پیرس میں قیام کر کے مسلمانوں کے علوم سیکھے تھے۔ وہ برملا اعتراف کرتا تھا کہ اس کے ماہرین کے لئے علمِ صحیح

کا واحد ذریعہ صرف عربی زبان اور اس کے علوم ہیں۔ یورپ کی موجودہ تہذیب پر مسلمانوں کی علمی تحریک کا بہت بڑا احسان یورپ میں طریقِ تجزیہ و تجربہ کا آغاز ہے جس سے سائنسی طریق کار اور عمل کی طرف توجہ ہوئی۔ ابتداء میں یہ عمل عقلی انسیت (Rational Humainism) کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بیکن کی مشہور کتاب (Advancement of learning) اسی رجحان کی آئینہ دار ہے۔ بعد میں اہل مغرب نے سائنسی اکتشافات کی طرف قدم بڑھایا۔ عربوں کے علوم و فنون کے اثرات کا عقلی اثر یہ ہوا کہ مشاہدہ اور عقلی تجربہ کی رسم پڑی جس کی وجہ سے یورپ نے استقراء سے کام لینا شروع کیا اور سائنس و ریاضی کی طرف توجہ زیادہ ہوئی کیونکہ ان کی بنیاد مشاہدہ و تجربہ پر ہے۔ اسلامی علوم و فنون اور ان کے اسالیب کے زیرِ اثر یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک اُبھری۔

خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1۔ دنیا کی سب سے بڑی علمی تحریک دورِ اسلامی میں پیدا ہوئی، تبصرہ کیجیے۔

سوال نمبر 2۔ علمِ قدیم اور علمِ حادث پر فقہاء و متکلمین کی آراء کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر 3۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ مسلمانوں کی علمی تحریک کے حوالے سے اثرات پر مفصل بحث کیجیے۔

6- برصغیر پاک و ہند میں تاریخ افکار و علوم اسلامی

عرب کے مسلمانوں اور برصغیر کے رہنے والوں کے درمیان رابطہ اگرچہ مسلمان تاجروں کے ذریعے اسلام کے ابتدائی دور میں ہی ہو گیا تھا مگر اہل ہند و اور عربوں کے مابین اولین باضابطہ رابطہ حجاج بن یوسف کے سپہ سالار محمد بن قاسم اور سندھ کے مقامی حکمران راجہ داہر کے لشکری تصادم کے حوالے سے قائم ہوا۔ اس تصادم میں مقامی قوتوں کو شکست ہوئی لیکن مسلمانوں کے نوجوان سردار نے فوجی کامرانی پر اکتفا نہیں کیا، اس نے مفتوحین کے دلوں پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد سندھ کے مقامی باشندوں کو نہ صرف جابر مقامی راجاؤں سے نجات مل گئی جو خصوصی طور

پر نچلے طبقات کا استحصال کرتے تھے بلکہ انہیں بالائی ہندو طبقے کی اجارہ داری سے بھی نجات مل گئی۔ اس کے بر خلاف نیا حکمران طبقہ ایک ایسے نظریہ حیات کو لے کر آیا تھا جس کی تخلیقی ترقی پسندانہ روح ابھی تک کار فرما تھی۔ چنانچہ اس نے ایک ایسے سیاسی، سماجی نظام کی بنیاد ڈالی جو قدیم نظام سے زیادہ ترقی پسندانہ تھا۔

کئی اسباب کی بناء پر برصغیر میں مقامی اور اسلامی ثقافتی گروہوں کے درمیان تہذیبی سطح پر ابلاغ کے اولین وسیلے کا وظیفہ تصوف نے سرانجام دیا اس لئے یہ بات تعجب انگیز نہیں کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت زیادہ تر صوفیاء کرام کے ذریعے ہوئی تاہم اس گروہ کا عمل دخل شمال ہند میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے قیام کے بعد شروع ہوا۔

تاریخ فرشتہ کے مصنف کے بقول محمود غزنوی کے جانشین شہاب الدین مسعود کے عہد میں بکثرت مساجد کی بنیاد پڑی اور ان کے ساتھ مدارس بھی قائم کئے گئے۔ اس عہد میں سندھ اور ملتان کی علمی حالت بہت اچھی تھی۔ ابن حوقل اور مقدسی جنہوں نے اس علاقے کی سیاحت کی تھی یہاں کے بلند علمی معیار کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔

اس زمانے میں مدارس کے لئے علیحدہ عمارتیں بنانے کا دستور نہیں تھا۔ عموماً یہ کام مساجد سے لیا جاتا تھا۔ مساجد کے علاوہ بزرگان دین کی خانقاہیں بھی مدارس کا کام دیتی تھیں۔ کیونکہ اس عہد کے مشائخ عظام صرف مشائخ طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر اساتذہ بھی تھے۔ ان خانقاہوں کے لئے جو اوقات حکومت کی طرف سے مقرر تھے ان کی آمدنی طلباء کے وظائف اور تعلیم کے اخراجات پر صرف کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں بادشاہوں اور امرائے دربار کے عظیم الشان مقبروں کے ساتھ بھی مدارس کا قیام ضروری تھا۔ چونکہ سلاطین کو مساجد و مدارس بنانے کا شوق تھا ان کے دیکھا دیکھی امرائے دربار بھی ان کی پیروی کرتے تھے بڑے بڑے معتبر علماء کے مکان بھی دارالعلوم کی حیثیت رکھتے تھے جنہیں حکومت نے فکر معیشت سے آزاد کر دیا تھا۔ علم و حکمت کے پیاس ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ قلقشندی نے اپنی تصنیف ''صبح الاعشی'' میں ہندوستان کے عرب سیاحوں کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ عہد مغلیہ میں تعلیمی ترقی بڑی درخشاں تھی۔ اکبر کے ایک فرمان میں یہ دفعہ ملتی ہے کہ

> ''جہاں تک ممکن ہو دنیا میں علم و ہنر کی اشاعت ہوتی رہے تاکہ اہل کمال دنیا سے معدوم نہ ہو جائیں اور ان کی یادگار صفحہ ہستی پر باقی رہے۔''

ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں اپنے زمانے کے نصاب تعلیم کے متعلق یہ بتایا ہے کہ اس میں اخلاقیات،

ریاضیات، زراعت اقلیدس مساحت ہیئت رمل، قواعد مال، آئین سلطنت، طب، طبیعات، الہیات اور تاریخ کے مضامین شامل تھے۔

جہانگیر نے اپنے عہد میں یہ قانون وضع کیا کہ حدود مملکت میں جہاں کہیں بھی کوئی مال دار رئیس یا بیرونی تاجر بغیر کسی جانشین یا وارث کے مر جائے تو اس کی تمام جائیداد واملاک بحق سرکار منتقل کر کے اس کی آمدنی مدرسوں اور خانقاہوں پر صرف کی جائے۔

بقول مسٹر کین، اورنگزیب عالمگیر نے اپنی حدود مملکت میں بے شمار مکاتب و مدارس قائم کئے۔ اس عہد کا یورپین سیاح الیگزینڈر ہملٹن لکھتا ہے کہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدرسے ہیں۔

7- برصغیر کے مسلمانوں کے علمی کارنامے

برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے خطے کے ساتھ ہمیشہ مخلصانہ وابستگی کا ثبوت دیا۔ اس کی خدمت علمی اور ترقی میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت ہیں کیا ۔اسی کے ساتھ اپنے مذہب اور اسلامی و عربی تہذیب سے بھی ان کی وفاداری برقرار رہی اسلامی دنیا سے کبھی ان کا رشتہ منقطع نہیں ہوا بلکہ تاریخ اسلام کے بعض ادوار میں ان کی حیثیت سالار کارواں کی رہی ہے۔

علوم اسلامیہ میں برصغیر کے مسلمانوں کی بے شمار تصانیف ہیں۔ کشف الظنون جیسی عمومی کتاب بھی (جس کا تعلق پورے عالم اسلام سے ہے) ہندوستانی علماء کی تصانیف کے تذکرے سے خالی نہیں۔ ذیل میں ان تصانیف کا تذکرہ کیا جارہا ہے جن کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی پہنچ چکی ہے اور انہیں وہاں بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے مشور مصنف امام لغت و حدیث حسن بن محمد الصغانی لاہوری کی کتاب "العباب الزافر" کا شمار عربی زبان کی مستند اور بیش قیمت ماخذ میں ہوتا ہے۔ علامہ سیوطی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ فن لغت کے امام تھے"۔ ان کی دوسری کتاب "مشارق الانوار "فن حدیث کی معروف کتاب ہے جو عالم اسلام میں مشہور و مقبول ہے۔

انہی کتابوں میں دسویں صدی ہجری کے مشہور محدث شیخ علی بن حسام الدین التقی برہان پوری کی کتاب "کنزل العمال" ہے۔اس کتاب کا شمار ان کتب احادیث میں ہوتا ہے جن سے محدثین نے بڑا استفادہ کیا ہے اور کتاب کے مصنف کے علم و فضل واحسان کا اعتراف کیا ہے جس نے انہیں بے شمار مصادر و مراجع کی ورق گردانی سے بچالیا۔

علامہ محمد طاہر پٹنی (986ھ) کی" مجمع الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخیار" بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔اس کتاب میں مولف نے احادیث کے مفردات و الفاظ کی شرح کی ہے اور ان سے متعلق محدثین کے اقوام کو جمع کر دیا ہے اس لئے اس کی حیثیت صحاح ستہ کی شرح کی ہو گئی ہے۔

ان مشہور و معروف تصانیف میں سے ایک "الفتاویٰ الھندیہ" ہے جو عام طور پر فتاوی عالمگیر کے نام سے مشہور ہے۔ مسائل فقہ میں یہ ایک اہم حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ان مراجع فقہیہ میں سے ہے جن پر اکثر اسلامی ممالک میں جن کا عمل اور عدالت کا قانون فقہ حنفی ہے۔ بڑا اعتماد کیا جاتا ہے۔

"مسلم الثبوت فی اصول الفقه" بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے اس کے مصنف علامہ محب اللہ بہاری (1119ھ) ہیں۔اس کتاب کو عالم اسلام کے علمی حلقوں میں قبول عام حاصل ہوا اور اس کی متعدد شروح و حواشی لکھے گئے۔

علمی و فنی اصطلاحات کے مشکل اور نازک موضوع پر بارہویں صدی ہجری میں مولانا محمد اعلی تھانوی کی کتاب "کشاف اصطلاحات الفنون" نہایت مفید اور مقبول تصنیف ہے جو علمی اصطلاحات کی مکمل ڈکشنری کی حیثیت رکھتی ہے۔اس سے قبل اس موضوع پر شدید ضرورت کے باوجود کوئی اچھی کتاب موجود نہ تھی۔ آج تک یہ کتاب اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے مراجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس فہرست میں ایک اہم اور عظیم کتاب شاہ ولی اللہ دہلوی (1176ھ) کی معرکۃ الآراء کتاب "حجة الله البالغه" ہے جس میں فلسفہ شریعت اسلامی اور احکام شریعت کے مضمرات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر بالکل منفرد اور یگانہ ہے عربی زبان اپنی وسعت کے باوجود اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

عربی لغت میں علامہ سید مرتضی بلگرامی (1205ھ) جو زبیدی کے نام سے معروف ہیں ،نے "تاج العروس" تحریر کی جو دس ضخیم جلدوں اور باریک مصری ٹائپ کے تقریباً پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب عربی

لغت کے فن میں ایک مستقل کتب خانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف کی زندگی ہی میں اس کتاب نے اتنی عالمگیر شہرت حاصل کرلی تھی کہ سلطان ترکی نے اس کا ایک نسخہ نقل کرا کے منگوایا۔

چودھویں صدی ہجری میں بھی ہندوستان نے بکثرت ایسے مصنفین پیدا کئے جو کثرت تصانیف میں پورے عالم اسلام سے بازی لے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک مستقل اکیڈمی اور سرگرم علمی انجمن کی تھی۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خان والی بھوپال (1307ھ) کی تصانیف کی تعداد دو سو بائیس ہے۔ جن میں چھپن کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ جو اپنے موضوع پر مفید اور معلومات سے پر ہیں۔ ان میں سے "فتح البیان فی تفسیر القرآن" (دس جلدیں) "ابجدالعلوم"، "التاج المکلل"، "البلغة فی الصول اللغة" اور "العلم الخفقاق من علم الاشتقاق" قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبدالحہ فرنگی محلی (1304ھ) کی تصانیف ایک سو دس ہیں جن میں سے چھیاسی کتابیں عربی میں ہیں، ان میں ''السعایه فی شرح شرح الوقایه''، ''مصباح الدجی''، ''التعلیق الممجد''اور''ظفر الامانی''، اہم علمی کارنامہ ہیں علمائے احناب کے تذکرہ میں ان کی کتاب''الفوائد البهیه''سب سے مشہور و مقبول کتاب ہے اور حنفی علماء کے حالات کے لئے زیادہ تر اسی سے نقل واقتباس کیا جاتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی (1366ھ) کی تصانیف کی تعداد نو سو دس (910) ہے ان میں سے تیرہ کتابیں عربی میں ہیں۔

کثرت تصنیف اور قلم کی روانی میں مولانا باقر بن مرتضی مدراسی (1220ھ) اور مفتی محمد عباس لکھنوی (1306ھ) بھی قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے عربی و فارسی میں مختلف موضوعات پر تصانیف و رسائل کی ایک بڑی تعداد یادگار ی چھوڑی ہے۔

مولانا محمود حسن خان ٹونکی (1366ھ) نے مصنفین اسلام کے تذکرہ و تراجم پر ایک عظیم الشان کتاب "معجم المصنفین" کے نام سے لکھی ہے۔ اس کی حیثیت ایک انسائیکلوپیڈیا کی ہے۔ ساٹھ جلدوں اور بیس ہزار صفحات پر مشتمل اس کتاب میں چالیس ہزار مصنفین کے حالات درج ہیں۔ کتاب کی وسعت وہمہ گیری کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مولف نے دو ہزار ایسے مصنفین کے حالات جمع کئے ہیں جن کا نام احمد ہے۔

7.1- فن حدیث کی خدمت

برصغیر کے علماء علوم دین کی خدمت میں انہاک و شغف کے لئے مشہور ہیں خصوصاً فن حدیث کی خدمت و تدریس اور متون حدیث کی شرح و تفسیر میں تو زمانہ مابعد میں قیادت و امامت انہی کے حصہ میں آئی ہے۔ علامہ رشید رضا مصری نے علمائے ہند کی ان خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"اگر ہندوستانی علماء اس زمانہ میں علوم حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو یہ فن مشرقی دنیا سے رخصت ہو جاتا کیونکہ مصر، شام عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری ہی سے علم حدیث زوال پذیر ہو گیا تھا۔"

برصغیر میں علم حدیث کی ترویج و اشاعت اور مقبولیت کا سہرا شیخ عبدالحق دہلوی (1052ھ) کے سر ہے جنہوں نے اپنی فاصلانہ شروح و تراجم کتب حدیث، نصف صدی تک مسلسل درس و تدریس اور اپنی مخلصانہ جدوجہد سے فن حدیث کو نئی زندگی بخشی اور علمی و تصنیفی حلقہ میں اس کی طرف توجہ کا آغاز ہوا۔ ان کی اولاد و تلامذہ نے اس کی ترویج و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بالآخر شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے علم حدیث کو ہر گھر میں پہنچایا۔

چودھویں صدی ہجری میں برصغر کے علماء نے فن حدیث پر بہت اہم کتابیں اور شرحیں لکھیں ہیں۔ مثلاً مولانا محمد اشرف ڈیانوی نے "عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤود" مولانا خلیل الرحمان سہارنپوری نے "بذل المجہود فی شرح سنن ابی داؤود" مولانا عبدالرحمان مبارک پوری نے" تحفة الاحوذی فی شرح سنن ترمذی" مولانا شبیر احمد عثمانی نے "فتح الملهم فی شرح صحیح مسلم" تحریر کیں۔ مولانا انور شاہ کشمیری کے صحیح بخاری سے متعلق افادات جو" فیض الباری" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ آج بھی علمائے حدیث اور طالب علموں کے لئے ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔

7.2 - برصغیر کے صوفیاء کرام اور معاشرہ پر ان کے اثرات

تصوف کے مشہور و مرکزی سلسلے اگرچہ برصغیر سے باہر پیدا ہوئے لیکن ان کو سب سے زیادہ فروغ اور مقبولیت برصغیر ہی میں حاصل ہوئی ان سلاسل تصوف میں بعض ایسی ہندوستانی شاخیں پیدا ہوئیں جنہوں نے خود مستقل سلاسل اور جداگانہ طریق سلوک و تربیت کی شکل اختیار کر لی اور ان میں بعض ایسے مجتہد اور مجدد فن پیدا ہوئے جن کی حیثیت ایک مستقل سلسلہ کے بانی اور امام کی ہے۔ مشہور سلاسل تصوف طریقہ قادریہ، طریقہ چشتیہ، طریقہ نقشبندیہ، طریقہ سہروردیہ کے علاوہ جنہوں نے برصغیر میں آکر بڑی ترقی کی ایسے طرق سلاسل بھی ہیں جو خاص یہیں کی پیداوار ہیں اور ان کا انتساب ان شخصیتوں کی طرف ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور یہیں دفن ہیں۔ مثلاً طریقہ مداریہ، طریقہ قلندریہ، طریقہ شطاریہ اور طریقہ مجددیہ جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور ہندوستان ہی سے باہر گئے۔

برصغیر کے صوفیاء نے جہاں لوگوں کے باطن کی اصلاح کی انہیں اچھی اخلاق اپنانے اور اخلاق رزیلہ (حسد کینہ، تکبر، حب جاہ، حب مال وغیرہ) سے اجتناب کی تعلیم دی۔ خدا کی یاد اور اس کی مخلوق کے ساتھ خیر خواہی اور خدمت لوگوں کو نفع پہنچانے اور ایثار و قناعت کی تلقین کی وہاں وہ ہمیشہ علم کے سرپرست اور پشت پناہ بھی رہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر اعلیٰ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ انہیں اس حقیقت کا ادراک تھا کہ خدا کی معرفت علم کے حصول کے بغیر ممکن نہیں اور یہ کہ جاہل صوفی بازیچہ ءاطفال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے بڑے بڑے عالی استعداد طالبین کو اس وقت تک اجازت نہیں دی جب تک انہوں نے اپنی علمی تکمیل نہیں کر لی۔ برصغیر کی تعلیمی تحریک اور یہاں کی علمی چہل پہل بالواسطہ اور بلاواسطہ مشائخ طریقت کی سرپرستی اور ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔

جس عظیم صوفی نے برصغیر میں مسلم تخلیقی فکر کی داغ بیل ڈالی اس کا نام سید علی بن عثمان ہجویریؒ ہے۔ وہ پینتیس یا چالیس برس کی عمر میں غزنی سے لاہور آکر قیام پذیر ہوئے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں عمومی صوفیانہ ادبی روایات کے برعکس ایک مکمل صوفیانہ نظام فکر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تصوف کے موضوع پر برصغیر میں لکھی جانے والی یہ اولین کتاب ہے جس کے ذریعے گویا پہلی مرتبہ اسلام تصوف کو ہندوستان میں پیش کیا گیا۔

سید علی ہجویری طریقت کی اہمیت کو شریعت کی اہمت سے کسی طور کم تصور نہیں کرتے۔ انہوں نے شریعت اور طریقت میں کسی ایک کو دوسرے پر قربان نہیں کیا ان کے نزدیک یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے ناگزیر

ہیں۔اس تصور کو پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ

"شریعت بغیر مغز حقیقت کے ایک ریاکاری ہے اور حقیقت بھی بغیر امتزاج شریعت کے منافقت ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ معرفت بغیر علم شریعت کے قبول کئے درست نہیں ہو سکتی اور شریعت پر عمل بغیر مقامات رسی کے پورا نہ ہو پائے گا اور جسے علم کی معرفت نہیں اس کے قلب پر جہل کی موت طاری ہے اور جسے علم شریعت نہیں اس کا قلب مرض نادانی میں گرفتار ہے[3]۔

سید علی ہجویری کے صوفیانہ فکر نظام میں فنا کے تصور کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ گیارہویں صدی میں یہ تصور دنیائے تصوف میں عام قبولیت حاصل کر رہا تھا۔ انہوں نے فنا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ماورائی اور شخصی خدا کے تصور کی نفی نہیں کرتا تاہم اگر فنا کو مقصود بالذات تصور کر لیا جائے تو فلسفہ وحدت الوجود کی اساس مرتب ہو جاتی ہے۔ سید علی ہجویری اس مقام تک نہیں جاتے وہ اسلام کے ماورئے خدا اور مخلوق کے مابین امتیاز کو برقرار رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ :

"بعض لوگوں کے نزدیک فنا سے مراد اپنی ذات اور اپنے وجود کو مٹا دینا ہے اور لقاء سے مراد خدا سے متحد ہو کر اس سے پیوستہ ہو جانا یا بالفاظ دیگر اس میں حلول کر جانا ہے۔ لیکن کھلی بات یہ ہے کہ قدیم اور محدث، خالق اور مخلوق صانع اور مصنوع کا امتزاج ممکن نہیں ہو سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ انسان کا وجود فنا ہو کر خدا کے وجود میں حلول کر جائے۔ کسی شخص کو خدا اور اس کی صفات کے ساتھ مشارکت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔"

سید علی ہجویری کے بعد برصغیر کی مسلم روحانی تاریخ میں جن لوگوں نے کم و بیش ایک صدی تک امتیازی حیثیت حاصل کی وہ زیادہ تر تصوف کے چشتی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ برصغیر میں اس سلسلے کا باقاعدہ آغاز خواجہ معین الدین چشتی سے ہوا۔

خواجہ معین الدین چشتی انسان دوستی اور محبت کے مسلک کا پرچار کرنے والے تھے۔ وہ ایک ایسے طرز زندگی کو ترجیح دیتے تھے جس میں نسل انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے ہر شے سے بے نیازی کا جذبہ پایا جائے۔ اس کو وہ عبادت

---

[3] (تصوف اسلام عبدالماجد دریا بادی:۷۵)

قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری عبادت ہے جس کا تعلق ذات کی ملکوتی دنیا سے ہے۔ دوسری باطنی عبادت ہے اس کا آدرش خدا کے ساتھ وحدت ہے اور اس کا تعلق عالم جبروت سے ہے۔ ان کے نزدیک فرد کا دل ایک ایسا کعبہ ہے جس کی چار دیواری فرد کا وجود ہے۔ اگر شکوک اور ناپائیدار اشیاء کی محبت کے پردے اٹھا دیئے جائیں تو فرد خود اپنی ذات کے اندر ذات باری تعالی کا دیدار کر سکتا ہے۔

برصغیر میں ابن عربی کے افکار کے مطالعے کا آغاز تیرھویں صدی ہی میں محدود طور پر شروع ہو چکا تھا اور ہندوستان کے مشائخ اور صوفیاء نے ان کے نظریا ت اور تصانیف کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ ابن عربی کے ابتدائی طالب علموں میں شیخ صدر الدین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہ برصغیر میں سہروردی سلسلے کے بانی شیخ بہاءالدین زکریا کے فرزند تھے۔ شیخ صدر الدین کے بعد برصغیر میں ابن عربی کی تعلیمات کے فروغ کے حوالے سے مسعود بک کا نام لیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی میں جب ابن عربی کی تعلیمات کو زیادہ فروغ ہوا تو ان کی کتب کی شرحیں لکھوانے کا رواج بھی شروع ہو گیا۔ برصغیر میں فصوص الحکم کی اولین شرح میر علی ہمدانی نے لکھی تھی یہ شرح عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی گئی تھی۔ کم و بیش اسی زمانے میں شیخ شرف الدین دہلوی نے "فصوص الحکم" کی شرح "عین الفصوص شرح الفصوص" کے نام سے لکھی تھی۔

ابن عربی کے ہندوستانی مداحوں میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی ممتاز ترین ہیں انہوں نے ابن عربی کی تصانیف میں "فصوص الحکم" کے علاوہ "عوارف" کی شرح بھی لکھی تھی۔ خود اپنی تصانیف میں بھی انہوں نے فلسفہ وحدت الوجود کی شرح و تبلیغ کی ہے ان تصانیف میں "مظہر العجائب، مکتوب قدوسیہ، رشد نامہ اور غرائب الفوائد" خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں شیخ عبدالقدوس گنگوہی وحدت الوجود اور قرآن و سنت کے عمومی رویئے میں موجود اختلاف کو تسلیم کرتے تھے۔ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ قرآنی تعلیمات کی توجیہہ و تشریح مکمل طور پر وحدت الوجود کی اصطلاحوں میں نہیں کی جا سکتی چنانچہ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگرچہ وحدت الوجود صراحت سے شریعت اسلامی میں نہیں ملتا لیکن اشارۃ النص اور دلالۃ النص میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ فلسفہ وحدت الوجود سے تمام تر عقیدت کے باوجود وہ اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ اس کی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ وہ اس کو ایک ایسا خدائی راز قرار دیتے تھے۔ جس کا اظہار کفر سے کم نہیں ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں برصغیر میں احیاء دین کا کارنامہ جس عظیم شخصیت نے انجام دیا وہ شیخ احمد سرہندی

ہیں جو مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور ہیں۔ اکبر کی بے اعتدالیوں نے سلطنت مغلیہ کی اسلامی حیثیت کو جس طرح مسخ کر رکھا تھا اور ملک بھر میں کچھ تو عجمی تصوف اور کچھ بھگتی تحریک کے زیر اثر جو ملحدانہ خیالات اور تحریکات پھیل رہی تھیں ان کے ازالے کے لئے مجدد الف ثانی کی مساعی فیصلہ کن ثابت ہوئیں۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، انہیں یہ فکر تھی کہ شریعت اور طریقت میں جو بعد ہے اسے ختم کیا جائے اور دونوں کو صحیح معنوں میں ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے۔ ان کے خیالات میں ظاہری اور باطنی تجربے میں پوری ہم آہنگی ہونی چاہیے ورنہ اس میں بدعت یا خود فریبی کا داغ لگ جائے گا۔ وہ شریعت کو مکمل طور پر جامع سمجھتے تھے جس میں دنیا اور آخرت کے تمام حقائق اور تجربات باطنی کے کل امکانات شامل ہیں۔ شریعت کے دو رخ ہیں۔ ایک ظاہری اور ایک حقیقی۔ ظاہری رخ کی بنیاد شکوک و شبہات سے بالا قرآن و سنت ہیں یہ علمائے ظاہر کا دائرہ علم ہے۔ بقیہ جزو علم جس کی قرآن نے تصریح نہیں کی ہے اور جو غیر واضح ہے یعنی متشابہات وہ علمائے راسخین کا حصہ ہے۔ یہ علماء جو رسول ﷺ کا اتباع کرتے ہیں ان صوفیا سے بہتر ہیں جو اولیاء اللہ کی پیروی کرتے ہیں اس لئے کہ نبوت ولایت سے اعلیٰ تر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک شرعی حکم کی بجا آوری نفسانی خواہش سے نجات کے لئے ہزار سالہ خود عائد کردہ مجاہدے اور روحانی ارتکاز سے کہیں بہتر ہے اور اس نقطہ نگاہ کے پیش نظر ہندوؤں کی تمام ریاضتیں ضیاع محض ہیں۔

مجدد الف ثانی خلاف شرع تصوف پر اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ آپ کے خیال میں اس سے ہندوستان میں اسلام میں تفرقہ پیدا کرنے اور اس کی بتدریج ہندومت میں جذب ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہذا انہوں نے مسلمانوں کے باطنی اور متصوفانہ شعار کو مذہبی شعار کا سختی سے پابند بنا دیا۔

شیخ احمد سرہندی کا ایک فکری کارنامہ صوفیانہ مابعد الطبعیات وحدت الوجود کے مقابلے میں وہ نظریہ پیش کرنا ہے جسے عام طور پر فلسفہ وحدت الشہود کا عنوان دیا جاتا ہے۔ بے شک ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود کے اخذ و قبول میں مراتب و منازل تھے مگر بعض انتہا پسند صوفی تو وحدالوجود میں اتنا غلو کرتے کہ وہ قریب قریب دائرہ اسلام سے باہر آ جاتے۔ اور کئی دوسرے فقط اسی حد تک اختیار کرتے جس حد تک اسلام مانع نہ ہو۔ وحدالوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذات باری اور مخلوق کے تعلق کو بیان کرتے ہیں اور ان کے مطالب کے لحاظ سے انہیں توحید عینی اور توحید ظلی بھی کہتے ہیں۔ تذکرہ غوثیہ میں ان دونوں کا فرق اس طرح سمجھایا گیا ہے:

"وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے لیکن ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن۔ باطن وجود ایک نور ہے جو جملہ عالم

کے لئے بمنزلہ ایک جان کے ہے۔ اسی نور باطن کا پرتو ظاہر وجود ہے جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم و صفت و فعل کہ عالم ظاہر ہے ان سب کی اصل وہی وصف باطن ہے۔ اور حقیت اس کثرت کی وہی وحدت صرف ہے۔ جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ افراد کائنات تجلیات حق ہیں۔

سبحان الذی خلق الاشیاء وھوعینھا اور اس کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے۔ الحق محسوس والخلق معقول حضرت مجدد الف ثانی کے نزدیک نظریہ وحدت الشہود میں قوت متحرکہ زیادہ ہے جب کہ ابن عربی کا نظریہ وحدت الوجود غیر متحرک اور جامد ہے وحدالشہود کا نعرہ ''ہر شے خدا ہے'' نہیں تھا بلکہ ان کا نعرہ یہ ہے کہ اللہ ہادی ہے وہ انسان اور اللہ کے مابین محبت باطنی کا تعلق قائم کرتا ہے نہ کہ اتحاد کا۔ خالق اور مخلوق کا باہمی رشتہ معیت یک دگر کا تھا۔ عارف کا یہ نعرہ غلط ہے کہ میں حق ہوں۔ اس کا نعرہ یہ ہونا چاہیے کہ

"میں اس کی مخلوق ہوں"

مندرجہ بالا سطور سے حضرت مجدد الف ثانی کے روحانی اسلوب خیال کا اندازہ ہوتا ہے اور تاریخ تصوف میں ان کی منفرد حیثیت سمجھتی جاسکتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ انہوں نے وحدت الوجود کی بالکل نفی نہیں کی بلکہ اسے وحدت الشہود سے نچلے درجے پر ایک صوفیانہ مقام ظاہر کیا ہے۔

> اٹھارویں صدی عیسوی میں شاہ ولی اللہ نے نظریہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی اور یہ تصور پیش کیا کہ ان دونوں فکری نظاموں میں پایا جانے والا اختلاف صرف ظاہری ہے اور فی الواقعہ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ انتہا پسند حلقوں کی جانب سے جس اختلاف کی نشاندہی کی جاتی ہے وہ التباس اور لفظی ہیر پھیر کا نتیجہ ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ شیخ احمد سرہندی نے ابن عربی اور ان کے بعض اتباع کے اقوال کو اپنے وجدان کے خلاف محسوس کیا ہے تو شاہ ولی اللہ کے بقول اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ان کے خیال میں ابن عربی سے یہ تصور منسوب کرنا غلط ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان عینیت موجود ہے۔ ابن عربی کا نقطہ نظر محض یہ ہے کہ مخلوق کا صدور وجود باری

تعالیٰ ہی سے ممکن ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان اضافت کی ماہیت کے مسئلے کو شاہ ولی اللہ نے تعلق کے حوالے سے حل کیا ہے۔ یہ تجلّی جس معروض پر اثرانداز ہوتی ہے اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ یوں موضوع اور معروض کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اس صورت حال کی فلسفیانہ توجیہہ وحدت الوجود کے تصور کے حوالے سے کی جاتی ہے، جو بجائے خود درست ہے۔ لیکن اگر ماہیت اشیاء کو اس سے ہٹ کر دیکھا جائے تو پھر وحدت الشہود کے تصور کی صداقت تسلیم کئے بغیر چارہ کار نہیں۔

خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 1۔ عہد سلاطین اور عہد مغلیہ کے نظام تعلیم پر بحث کیجیے۔

سوال نمبر 2۔ برصغیر کے مسلمانوں کی ان کتب پر تبصرہ کیجیے جن کو ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔

سوال نمبر 3۔ نظریہ وحدت الوجود اور نظریہ وحدت الشہود کی وضاحت کیجیے اور ان کے بنیادی نکات کا آپس میں موازنہ کیجیے۔

یونٹ نمبر2

قرآن، علوم القرآن اور علم تفسیر

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 31

یونٹ کے مقاصد 32

1-حفاظت قرآن 33

2-علوم القرآن 35

2.1 علم النحو، علم الصرف اور علم البلاغت 35

2.2 اعجاز قرآن 35

2.3 علم قرأت 36

2.4 تجوید 36

3-علم التفسیر 37

3. 1 تفسیر کا لغوی معنی 37

2.3 تفسیر کا اصطلاحی مفہوم 38

4- تفسیر کا ارتقاء 39

5-عہد رسالت و عصر صحابہ کی تفسیری خصوصیات 40

6-تفسیر دور تابعین میں 41

6.1-دور تابعین کی تفسیری خصوصیات 42

6.2 تفسیر و عصر تدوین میں 43

6.3-تفسیر عصر تدوین کے بعد 45

7-مختلف تفسیری رجحانات 45

یونٹ کا تعارف

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اللہ نے اپنے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔ یہ دین اسلام کا سرچشمہ ہے۔ قدرتی طور پر صحابہ اور بعد میں آنے والے مسلمانوں نے اس کی حفاظت، فہم، تدبر اور تفسیر وغیرہ کے لئے خصوصی کوششیں کیں اور اس کی کتابت واملاء اور اس کی قرأت کے اصول مدون کئے، علاوہ ازیں اس کے معانی کو سمجھنے کے لئے کئی فنون کی بنیاد رکھی اور قرآن میں محکمات ومتشابہات، ناسخ ومنسوخ اور تاویل واستدلال کے طریقوں پر ایسی بحثیں کیں جن کے باعث قرآن مجید کے ارد گرد کئی علوم ظہور میں آ گئے۔

مسلمانوں کے ہاں عصری شعور کو زندہ رکھنے میں قرآن مجید کی تفسیر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ قرآن مجید کا تاریخ انسانی سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ اوّلاً یوں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانی ہدایت کے تاریخی سلسلے کی آخری کڑی ہے جسے تاابد ہدایت ورہنمائی بخشتا ہے۔ دوم یوں کہ قرآن مجید انسانی تاریخ کو استدلال کے طور پر پیش کرتا ہے جو گواہی بھی ہے، دلیل بھی اور درس عبرت بھی۔ سوم یوں کہ قرآن مجید ایک ہی بار نازل نہیں کیا گیا بلکہ واقعات وحالات کے سیاق میں اور ان کے حوالے سے ایک تاریخی پس منظر کے ساتھ اتارا گیا۔ آیات قرآنی اور تاریخ انسانی کے اس ربط نے قرآن فہمی کے لئے آسان اور ٹھوس بنیادیں ہی نہیں فراہم کیں بلکہ ان کے رشتے کو بھی واضح کیا جس کی وجہ سے ہر دور میں اس کی تفسیر ممکن ہوئی۔

آخری پیغام ہدایت ہونے کی وجہ سے قرآن جہاں ابدیت کا حامل ہے وہاں عصریت بھی اس کی لازمی خصوصیت ہے۔ یہ ہر زمانے، ہر معاشرت، ہر ثقافت، ہر علاقے اور ہر قوم کا ہم عصر ہے۔ یہ ہر دور کے تقاضوں اور ضروریات کا ادراک اور ان کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ تفسیری ادب اس کی زندہ مثال ہے جس میں قرآن فہمی کے تمام پہلو اپنے مختلف رنگوں اور جہتوں میں جلوہ گر ہیں۔

پیش نظر اس یونٹ میں آپ قرآن، علوم قرآن اور خاص کر علم تفسیر کے آغاز وارتقاء، اس کی خصوصیات اور اس کے مختلف رجحانات کا مطالعہ کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

ہمیں امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ کو اس قابل ہو جائیں گے کہ آپ:

1۔ قرآن مجید کی فنی تعریف کر سکیں۔

2۔ قرآن مجید کی تدوین میں احتیاطی تدابیر کو بیان کر سکیں۔

3۔ قرآن کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے کے لئے وجود میں آنے والے علوم کی وضاحت سکیں۔

4۔ علوم قرآن کے موضوع پر لکھی گئی بنیادی کتابوں اور ان کے مصنفین کے بارے میں تبصرہ کر سکیں۔

5۔ علم تفسیر کے آغاز اور اس کے ارتقاء پر بحث کر سکیں۔

6۔ عہد رسالت، عہد تابعین اور عہد تدوین کی تفسیری خصوصیات اور مختلف تفسیری رجحانات اور ان کی نمائندہ تفاسیر کے بارے میں جائزہ لے سکیں۔

1-حفاظت قرآن

قرآن مجید چونکہ ایک ہی مرتبہ پورا نازل نہیں ہوا، اس کی مختلف آیات حسب ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل ہوتی رہیں اس لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے شروع سے ہی ایک جگہ لکھ کر کتابی صورت میں مدوّن کر دیا جائے چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حفظ پر دیا گیا۔ شروع شروع میں جب حضور اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ اس کے الفاظ کو اسی وقت دہرانے لگتے تھے تاکہ وہ اچھی طرح سے آپ کو یاد ہو جائیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

{لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ - إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ}[4]

"آپ قرآن کو جلد یاد کر لینے کے خیال سے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کو جمع کرنا اور پڑھوانا تو ہم نے اپنے ذمے لے لیا ہے"۔

اب جونہی آپ پر قرآنی آیات نازل ہوتیں وہ بہ تائید ایزدی آپ ﷺ کو یاد ہو جاتیں۔ آپ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرائیل کو قرآن مجید سنایا کرتے تھے۔ جس سال آپ ﷺ کی وفات ہوئی ہے اس سال آپ ﷺ نے دو مرتبہ حضرت جبرائیل کے ساتھ دور کیا۔

صحابۂ کرام کو بھی قرآن مجید یاد کرنے کا خاص شغف تھا اور ان میں سے کئی ایک نے اپنی زندگیاں اس کام کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔

حفاظت قرآن کا اصل مدار اگرچہ حافظہ پر تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ نے اس کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا تھا۔ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا، آپ ﷺ اسے لکھوا دیتے اور ساتھ ہی یہ ہدایت فرما دیتے کہ اسے فلاں سورت یا فلاں آیت کے بعد لکھا جائے۔ اس زمانے میں چونکہ کاغذ کم یاب ہوتا تھا اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے۔

---

[4] [القيامة: 16، 17]

بعض صحابۂ کرام بھی اپنی یادداشت کے لئے قرآن مجید اپنے پاس لکھ لیتے تھے۔ بعض صحابہ کے پاس ایک سورت لکھی ہوتی، کسی کے پاس چند سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات ہوتیں۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر نے ضروری سمجھا کہ قرآن مجید کے ان منتشر حصوں کو یک جا کر کے محفوظ کر دیا جائے۔ انہوں نے اس کام کے لیے حضرت زید بن ثابت کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی۔ حضرت زید اگرچہ خود بھی قرآن مجید کے حافظ تھے اور ان کے پاس حضور اکرم ﷺ کا لکھوایا ہوا قرآن مجید بھی موجود تھا مگر انہوں نے احتیاط کے پیش نظر اعلان کروادیا کہ جس کے پاس قرآن مجید کا کوئی حصہ لکھا ہوا ہے وہ لے آئے اور جب کوئی شخص ان کے پاس قرآن مجید کی لکھی ہوئی کوئی آیات لے کر آتا تو آپ حسب ذیل طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔

1. سب سے پہلے اپنی یاداشت سے اس کی توثیق کرتے۔
2. کوئی لکھی ہوئی بات اس وقت تک قبول نہ کی جاتی تھی جب تک کہ دو قابل اعتبار گواہ اس بات کی گواہی نہ دے دیں کہ یہ آیت آنحضرت ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھی۔
3. اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا ان مجموعوں کے ساتھ موازنہ کیا جاتا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے۔

حضرت زید نے اس درجہ نہایت احتیاط کے ساتھ قرآنی آیات کو جمع کر کے انہیں مرتب شکل میں تحریر فرمایا اور انہیں ایک کتابی شکل دی۔

حضرت عثمان جب خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں میں پہنچ چکا تھا۔ غیر عرب لوگ کثرت سے اسلام قبول کرنے لگے۔ جو عربی زبان سے آشنا نہ تھے اس لئے ان کا لب ولہجہ عربوں سے مختلف تھا، علاوہ ازیں عرب کے بھی مختلف قبائل کے آپس کے لہجوں میں اختلاف تھا۔ مثلاً یمن کے رہنے والے "سین" کو "تاء" بولتے تھے۔ اس طرح مختلف قبیلوں کے لوگ قرآن کو اپنے اپنے لہجے میں پڑھتے تھے۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ یہ فرق الفاظ کا نہیں بلکہ لہجے کا ہے جس سے معانی میں فرق نہیں پڑتا لیکن غیر عرب لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہ تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور بعض جگہوں پر ناخوشگوار واقعات بھی رونما ہوئے۔

حضرت حذیفہ بن یمان کے توجہ دلانے پر حضرت عثمان نے حضرت ابو بکر والا نسخہ منگوایا اور حضرت زید بن

ثابت کو یہ ذمہ داری سونپی کہ اس کی مزید نقلیں تیار کی جائیں چنانچہ انہوں نے اس سے پانچ یا سات نسخے تیار کئے۔ مسجد نبوی ﷺ میں سب کے سامنے پڑھا گیا۔ حضرت عثمان نے تمام صوبوں میں اس کا ایک ایک نسخہ بھیجا۔ آج دنیا بھر میں قرآن حکیم کے جتنے بھی نسخے ہیں وہ حضرت عثمان کے تیار کردہ مصاحف کے مطابق ہیں۔ اس طرح قرآن حکیم آج بھی میں اسی طریقے سے لکھا اور پڑھا جاتا ہے جس طرح رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں لکھا یا پڑھا جاتا تھا۔

2-علوم القرآن

قرآن حکیم کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے اور اس کے معانی و مفاہیم کو سمجھنے کے لیے کئی علوم وجود میں آئے اور ہر علم پر کئی کتب تحریر کی گئیں۔ ذیل میں ان علوم پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔

2.1 علم النحو، علم الصرف اور علم البلاغت

جیسا کہ آپ کے علم میں ہو گا کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اسلامی مملکت کی سرحدیں وسیع ہونے لگیں اور کثرت سے وہ لوگ اسلام قبول کرنے لگے جن کی زبان عربی نہیں تھی۔ ایسے لوگوں کے لیے قرآن پڑھنا اور اس کے مطالب کو صحیح طور پر سمجھنا دشوار تھا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے مسلمانوں نے علم النحو، علم الصرف اور علم البلاغت وغیرہ تشکیل دیے۔ اور ان فنون پر کئی کتابیں تحریر کیں جن کی تفصیل آپ کو یونٹ "علوم ادبیہ "میں پڑھیں گے۔

2.2 اعجاز قرآن

قرآن حکیم کی حقانیت کی ایک واضح دلیل اس کا اعجاز ہے یعنی یہ ایک ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ اسی وجہ سے اسے آنحضرت ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کا یہ اعجاز کئی طرح سے ہے، قرآن مجید کے الفاظ، تراکیب، اسلوب، اور نظم میں دنیا کا کوئی اور کلام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا علاوہ ازیں اس کی بیان کردہ پیشن گوئیاں اور انکشافات حرف بہ حرف پوری ہو رہی ہیں۔

اعجاز القرآن پر بہت سے لوگوں نے مستقل کتابیں لکھیں ہیں۔ اس فن پر سب سے پہلے جاحظ (م255ھ) نے "نظم القرآن" تصنیف کی تھی، اس کے علاہ خطابی، رمانی، ملکانی، ابن سراقہ، امام رازی اور قاضی ابو بکر باقلانی نے بھی اعجاز القرآن پر کتب تحریر کیں۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ اس موضوع پر باقلانی کی کتاب جیسی کوئی دوسری تصنیف نہیں ہے۔

2.3 علم قرأت

قرآن مجید کے نقل کرنے والوں کی تعداد ہر دور میں اتنی زیادہ رہی ہے جس کا شمار ممکن نہیں۔ اس طرح ہر دور میں قرآن کے الفاظ و معانی پر بحث و نظر کی جاتی رہی ہے۔ اہل علم نے ان بے شمار لوگوں میں سے صرف انہی لوگوں کے نام لئے ہیں جن کا قرآن سے شغف بہت بڑھا ہوا تھا اور تدبر قرآن میں اپنے اس انہماک کی وجہ سے لوگوں میں وہ مقبول ہوئے۔

امام ابو عبید قاسم بن سلام نے قرأتوں سے متعلق اپنی کتاب کی ابتداء میں صحاب وتابعین اور ان کے بعد کے جلیل القدر آئمہ میں سے ان لوگوں نے نام لکھے جن سے کسی طرح کی قرات منقول ہوئی ہے۔

قرات کے باب میں ائمہ کی بکثرت تصنیفات ہیں جن میں سے اکثر لوگوں نے مختلف بلاد وامصار کے آئمہ قرات میں سے صرف ان سات قراء کی قراتوں کے تذکرہ پر ہی اکتفا کیا ہے جن پر اجماع ہو چکا ہے اگرچہ ان کی طرف منسوب قراءتوں کی بابت بعض امور میں بعد میں اختلاف بھی ہوا ہے۔

یہ سات قراء امام ابو عبد الرحمن، نافع بن ابو نعیم، ابو معبد عبداللہ بن کثیر المکی، ابو عمر بن العلاء البصری، ابو عمران عبداللہ بن عامر الدمشقی، ابو بکر عاصم بن ابی النجود، ابو عمارہ حمزہ بن حبیب الزیات اور ابو الحسن علی بن حمزہ الکسائی ہیں۔

2.4 تجوید

تجوید قراء کی اصطلاح میں اس امر کا نام ہے کہ قرآن کی قرأت میں الفاظ بہترین طریقے سے ادا ہوں، ان کے بولنے میں کسی قسم کا عیب نہ ہو یعنی صحت مخارج کے ساتھ اس طرح قرأت کی جائے کہ حسن ولطف اپنی انتہا کو پہنچ جائیں۔

علمائے تجوید نے جن طریقوں اور ضابطوں کو وضع کیا ہے ان کی مشق کرنے سے انسان میں فصاحت کا ذوق

اور حسن بیان کا سلیقہ بھی حاصل ہوتا ہے اور مشکل ترکیبیں سہل اور زبان پر آسان اور خوشگوار ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے ابن المقفع کہتا ہے کہ جب زبان کی الٹ پلٹ زیادہ ہوتی تو اس کی شیرینی بڑھ جاتی ہے۔

اس فن پر بے شمار کتب لکھی گئی ہیں امام جزری نے غایتہ المنتھیٰ میں موسیٰ بن عبید اللہ بن یحیی بن خاقان ابو مزاحم الخاقانی البغدادی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میری معلومات کی حد تک سب سے پہلے علم تجوید میں انہوں نے ہی کتاب تصنیف کی۔

خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1۔ جمع وتدوین قرآن میں کن احتیاطی تدابیر کو ملحوظ خاطر رکھا گیا؟

سوال نمبر 2۔ قرآن مجید کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنے کے لئے کون سے علوم منضبط کیے گئے؟

سوال نمبر 3۔ طبقات القراء پر لکھی گئی کتب کی فہرست تیار کیجیے۔

3- علم التفسیر

3 .1 تفسیر کا لغوی معنی

لفظ تفسیر عربی زبان میں باب تفعیل کا مصدر ہے، اس کا مادہ "ف س ر" ہے۔ جس کے معانی ہیں: ظاہر کرنا، کھول کر بیان کرنا، کسی مبہم یا مجمل بات کی وضاحت کرنا یا کسی مخفی چیز سے پردہ اٹھانا۔

ابن منظور (630ھ۔711ھ) لکھتے ہیں:

" الفَسْرُ: كَشْفُ المُغَطّى، والتَّفْسير كَشف المُراد عَنِ اللَّفْظِ المُشْكل [5] -

[5] ابن منظور، جمال الدین محمد بن مکرم: لسان العرب (مادۃ: ف س ر): نشر الادب الحوزہ، قم، ایران: ص ۵

"فسر کے معنی ہیں ڈھانپی ہوئی چیز کو کھولنا اور تفسیر کے معنی ہیں مشکل الفاظ کی مراد سے پردہ اٹھانا"

لفظ تفسیر بیان اور وضاحت کے معنوں میں خود قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا[6]

"اور نہیں لاتے یہ لوگ تیرے سامنے کوئی عجیب سوال مگر یہ کہ ہم آپ کے پاس اس کا سچا اور قطعی جواب اور بہترین وضاحت لے آتے ہیں"۔

3.2 تفسیر کا اصطلاحی مفہوم

مشہور مفسر ابو حیان اندلسی (م745ھ) نے علم تفسیر کی درج ذیل تعریف کی ہے:

''التَّفْسِيرُ عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيهِ عَنْ كَيْفِيَّةِ النُّطْقِ بِأَلْفَاظِ الْقُرْآنِ، وَمَدْلُولَاتِهَا، وَأَحْكَامِهَا الْإِفْرَادِيَّةِ وَالتَّرْكِيبِيَّةِ، وَمَعَانِيهَا الَّتِي تُحْمَلُ عَلَيْهَا حَالَةُ التَّرْكِيبِ، وَتَتِمَّاتٍ لِذَلِكَ '' [7]

"علم تفسیر وہ علم ہے جس میں قرآن مجید کے الفاظ کے تلفظ، ان کے معانی و مفاہیم اور ان کے افرادی و ترکیبی احکام اور ان کے معانی سے بحث کی جاتی ہے جو ان الفاظ سے مرکب حالت میں مستنبط ہوتے ہیں، اور ان کے تتمول (مکمّلات) سے بحث کی جاتی ہے۔"

علامہ زرکشی (م794ھ) نے البرھان فی علوم القرآن میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"التَّفْسِيرُ عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهِ فَهْمُ كِتَابِ اللَّهِ الْمُنَزَّلِ عَلَى نَبِيِّهِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيَانُ مَعَانِيهِ وَاسْتِخْرَاجُ أَحْكَامِهِ وَحِكَمِهِ وَاسْتِمْدَادُ ذَلِكَ مِنْ عِلْمِ اللُّغَةِ وَالنَّحْوِ وَالتَّصْرِيفِ وَعِلْمِ الْبَيَانِ وَأُصُولِ الْفِقْهِ وَالْقِرَاءَاتِ وَيَحْتَاجُ لِمَعْرِفَةِ أَسْبَابِ النُّزُولِ وَالنَّاسِخِ وَالْمَنْسُوخِ"[8]

"تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے قرآن کریم کے مطالب و معانی معلوم کیے جاتے ہیں اور

---

[6] الفرقان: 33

[7] الاندلسی، ابو حیان: البحر المحیط: ۱/۱۲۱

[8] الزرکشی، بدر الدین: البرھان فی علوم القرآن: ۱/۱۳۔

اس میں مندرج احکام ومسائل اور اسرار وحکم سے بحث کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں علم لغت، نحو، صرف، علم بیان، اصول فقہ اور قراءات سے مدد لی جاتی ہے، علاوہ ازیں اس کے لیے اسبابِ نزول اور ناسخ ومنسوخ کی معرفت بھی ضروری ہے"۔

تفسیر کی ایک مختصر تعریف علامہ زرقانی (م1948ء) نے مناہل العرفان میں یوں کی ہے:

"علم يبحث فيه عن القرآن الكريم من حيث دلالته على مراد الله بقدر الطاقة البشرية " [9] ۔

"اصطلاح میں تفسیر وہ علم ہے جس میں قرآن کے بارے میں بحث کی جاتی ہے اس حیثیت سے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مراد پر بشری طاقت کے مطابق دلالت کرتا ہے۔"

درج بالا بحث سے یہ ثابت ہوا کہ لغوی اعتبار سے تو تفسیر کا اطلاق ہر قسم کی وضاحت پر ہوتا ہے جبکہ اسلامی علوم کی اصطلاح میں تفسیر کا لفظ قرآن کی تشریح وتوضیح کے ساتھ مخصوص ہے حتی کہ حدیث رسول ﷺ کی تشریح کو بھی تفسیر نہیں کہا جاسکتا بلکہ شرح الحدیث کہا جاتا ہے، اسی بناپر قرآن کریم کی آیات کی وضاحت کرنے والے کو مفسر اور احادیث کی وضاحت کرنے والے کو شارح کہا جاتا ہے۔

4- تفسیر کا ارتقاء

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا تھا جو اس وقت وہاں کے لوگوں کی مادری زبان تھی، اس لئے قرآن کے معانی و مطالب معلوم کرنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی تاہم بعض مقامات میں جہاد زیادہ اجمال ہوتا ہے صحابہؓ خود رسول اکرم ﷺ سے دریافت کر لیا کرتے تھے چنانچہ تفسیر کا سب سے پہلا بیش قیمت سرمایہ وہ تفسیری روایات ہیں جو مختلف کتبِ حدیث میں منقول ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کے بعد جن اسلامی فتوحات کا دائرہ آگے بڑھا اور تمدن میں وسعت آئی تو دینی احکام میں نئی نئی صورتیں پیش آنے لگیں ۔اس کے زیر اثر قرآن کریم کی آیات واحکام پر غور وفکر کرنے کی بنیاد پر پڑی تمام صحابہؓ فہم

---

[9] الزرقانی، عبد العظیم: مناہل العرفان فی علوم القرآن؛ دار المعرفۃ للطبعۃ، بیروت: ۱۹۸۷ء/۱۴۰۷ھ: ص: ۱/۳۳۴

قرآن میں برابر نہ تھے اور تفسیر کا طرز و انداز بھی مختلف تھا۔ صحابہؓ قرآن کی وہی تفسیر بیان کرتے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ رسول اکرم ﷺ سے سنی تھیں یا جس آیت کا سبب نزول انہوں نے خود ملاحظہ کیا تھا یا جو چیز بطریق اجتہاد ان پر منکشف ہوتی۔ صحابہؓ میں سے دس حضرات کو اس فن میں امتیاز حاصل تھا جن میں چاروں خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسی اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین شامل ہیں۔

5- عہد رسالت و عصر صحابہ کی تفسیری خصوصیات

1. دور زیر تبصرہ میں پورے قرآن کی تفسیر بیان نہیں کی گئی تھی بلکہ صرف اسی حصہ کی جس میں کچھ دقت و غموض پایا جاتا تھا۔ عصر نبوت ﷺ و صحابہؓ سے جوں جوں دوری ہوتی جاتی تھی اسی نسبت سے قرآن کے معانی میں خفاء و اشتباہ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور اسی کے زیر اثر تفسیر بھی بڑھتی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ اگلے تاریخی ادوار میں جملہ آیات قرآنی کی تفسیر مکمل ہوگئی۔
2. قرآن عزیز کے معانی و مطالب کے فہم و ادراک میں صحابہ کے یہاں بہت کم اختلاف پایا جاتا تھا۔
3. حضرت صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین و قرآن کریم کے اجمالی معنی پر اکتفا کرتے تھے اور تفصیلات کی طلب و تلاش کو ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ مثلاً قرآن کریم کی آیت: (وفاکھۃ و ابا) اور ''پھل میوے اور سبزہ ''میں وہ صرف اسی بات کے سمجھنے کو کافی تصور کرتے تھے کہ اس آیت میں بندوں پر انعامات ربانی کا ذکر کیا گیا ہے۔
4. صحابۂ کرام مختصر ترین الفاظ میں لغوی معنی کی تشریح کرنے کو کافی خیال کرتے تھے۔ مثلاً آیت "غیر متجانف الاث "گناہ کا ارادہ کرنے والا نہ ہو۔

   صحابۂ کرام "متجانف" کا مطلب صرف "متعرض لاثم " (گناہ سے تعریض کرنے والا) کے الفاظ میں بیان کر دینے کو کافی سمجھتے تھے۔
5. صحابۂ کرام قرآنی آیات سے فقہی احکام کا استنباط شاذ و نادر ہی کرتے تھے۔ چونکہ صحابہ متفق العقائد تھے اور ان

میں ابھی تک مذہبی و حزبی اختلافات کا ظہور نہیں ہوا تھا اس لئے وہ گروہی تعصبات کی تائید و حمایت کے لئے آیات سے استدلال کرنے کے عادی نہ تھے۔

6. عصری صحابہ میں تفسیر کی تدوین نہیں ہوئی۔ بخلاف ازیں تفسیر کی تدوین کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا۔

البتہ بعض صحابہ نے اپنے مصاحف ہی میں تفسیری الفاظ تحریک کر لئے تھے جن کو بعض لوگوں نے قرات کی مختلف صورتیں اور قرآن کا جزو خیال کر لیا ہے۔

7. اس عہد میں تفسیر کی کوئی جداگانہ منظم صورت نہیں تھی۔ بلکہ تفسیری اقوال احادیث کے ساتھ ملے جلے اور حدیث ہی کے فروع و اجزاء خیال کیے جاتے تھے۔ احادیث کی طرح متفرق آیات کی تفسیر بلا نظم و ترتیب الگ الگ بیان کی جاتی تھی۔ احادیث بھی اسی طرح متفرق تھیں۔ [10]

6- تفسیر دور تابعین میں

عصر صحابہ ختم ہوتے ہی تفسیر قرآن کا پہلا دور ختم ہوا۔ تفسیر کے دوسرے مرحلے کا آغاز عصر تابعین سے ہوا جنہوں نے صحابہ کے چشمہ فیض سے اپنی علمی پیاس بجھائی تھی۔

اس دور کے مصادر تفسیر حسب ذیل تھے:

I. تفسیر القرآن بالقرآن
II. مرفوع احادیث
III. صحابہ کے تفسیری اقوال
IV. اہل کتاب اور ان کی کتب مقدسہ
V. تابعین کا اجتہاد و استنباط

---

[10] التفسیر والمفسرون

عہد رسالت اور خلاف راشدہ میں اسلامی فتوحات کا دور دورہ رہااور مسلمان مدینہ منورہ سے نکل کر دور دراز علاقوں میں پھیل گئے جن میں حاکم، قاضی، معلم سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ یہ لوگ جہاں بھی گئے وہاں رسول اکرم ﷺ سے حاصل کردہ علم و فضل بھی ساتھ لیتے گئے، جہاں بکثرت تابعین نے ان کی ہم نشینی سے فائدہ اٹھایااوران سے علم حاصل کر کے لوگوں کواس سے مستفیض کرنے لگے۔

مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ اور بصرہ اس دور میں تفسیر کے اہم مراکز تھے، مکہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کے اصحاب و تلامذہ کا فیض جاری تھا جن میں سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، طائوس اور عطاء بن ابیر باح کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔

مدینہ میں فن تفسیر کی تاسیس حضرت ابی بن مکعب کے مساعی کی مرہون منت ہے۔ اکثر تابعین نے آپ سے کسب فیض کیا جن میں ابوالعالیہ اور محمد بن کعب القرظی قابل ذکر ہیں۔

کوفہ کے مکتب تفسیر کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعود کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اس مدرسہ کے وابستگان دامن میں علقمہ بن قیس، مسروق، مرہ ہمدانی اور عامر شعبی نے بہت شہرت حاصل کی۔

بصرہ میں حسن بصری اور ابن سیرین کی ذات تفسیر قرآن میں مرجع خلائق تھی۔

6.1-دور تابعین کی تفسیری خصوصیات

1. اس دور کی تفسیر میں اسرائیلیات و نصرانیات کی آمیزش شروع ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں بکثرت اہل کتاب حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان کے قلب و ذہن کے ساتھ ایسے اخبار و وقائع پیوست تھے جن کا شرعی احکام کے ساتھ کچھ تعلق نہیں مثلاً آغاز تخلیق کے واقعات یا ظہور کائنات و اسرار وجود سے متعلق قصے کہانیاں۔ قرآن مجید یہود و نصاری کے جن واقعات کے متعلق اشارہ کرتا ہے نفوس انسانی اس کی تفصیلات سننے کے لئے بے تاب تھے۔

تابعین نے اس ضمن میں سہل نگاری سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ کے بکثرت احادیث و وقائع تفسیر میں کسی نقد و تبصرہ کے بغیر شامل ہو گئے۔ اس قسم کی روایات زیادہ تر ان لوگوں سے نقل ہو کر

مسلمانوں میں پھیل گئیں جو اہل کتاب میں سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ مثلاً عبدالہب بن سلام، کعب الاخبار، وہب بن منبیہ، عبدالملک بن عبدالعزیز، ابن جریج وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ تفسیر کے سلسلے میں اسرائیلیات کی جانب رجحان و میلان تابعین واتباع تابعین پر جرح و نقد کا موجب بنا۔

2. دور تابعین کی تفسیر پر بھی نقد و روایت کی چھاپ بدستور رہی۔ مگر عہدِ رسالت ﷺ میں عصر صحابہ کی طرح اس اخذ و نقل میں عموم شامل نہ تھا بلکہ اس پر اختصاص کی مہر لگی ہوئی تھی۔ جس کا مطلب ہے کہ ہر شہر کے رہنے والے اپنے شہر کے امام اور عالم کے اقوال سے اعتناء کرتے تھے۔ چنانچہ اہل مکہ حضرت ابن عباس سے، مدینہ والے حضرت ابی ابن کعب اور عراقی حضرت ابن مسعود سے تفسیری اقوال نقل کیا کرتے تھے۔

3. اس دور میں مذہبی اختلافات کی تخم ریزی ہوئی اور اس قسم کے تفسیر اقوام منظر عام پر آئے جن میں اس اختلاف کی رنگ آمیزی کی گئی تھی۔ مثلاً قتادہ بن دعامہ سدوسی منکر تقدیر تھا اور اس کی تفسیر میں قدریت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس کے پیش نظر بعض لوگ اس کی روایات سے احتراز کرتے تھے۔ اس کے عین برخلاف حسن بصری کی تفسیر اثبات تقدیر کے عقیدہ پر مبنی ہے وہ منکر تقدیر کی تکفیر کرتے ہیں۔

4. عہدِ صحابہ کے اندر تفسیر قرآن میں چنداں اختلاف نہ تھا۔ عصر تابعین میں اختلاف کی خلیج بہت وسیع ہو گئی تاہم تابعین کا یہ تفسیری اختلاف متاخرین کی نسبت بہت کم تھا۔[11]

6.2 تفسیر عصر تدوین میں

تفسیر نویسی کے تیسرے دور کا آغاز عصرِ تدوین سے ہوتا ہے۔ یہ دور اموی خلافت کے اول و آخر سے لے کر خلافت عباسیہ کے اوائل تک پھیلا ہوا ہے۔

آغاز کار میں تفسیری اقوال کو بطریق روایت نقل کیا جاتا تھا۔ صحابۂ کرامؓ رسول اکرم ﷺ سے بھی یہ اقوال نقل کرتے تھے اور باہم ایک دوسرے سے بھی۔ اس طرح تابعین صحابہ سے بھی کسب فیض کرتے تھے اور اپنے معاصر تابعین سے بھی۔ یہ تفسیر قرآن کا پہلا مرحلہ تھا۔

---

[11] (التفسیر المفسرون)

عصر صحابہ وتابعین کے بعد تفسیر صحابہ کے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا۔ یہ اس وقت ہوا جب تدوین حدیث کی داغ بیل پڑی۔ حدیث نبوی مختلف ابواب میں منقسم تھی اور ان میں ایک باب تفسیر پر مشتمل تھا۔ اس دور میں ایسی کوئی کتاب تالیف نہیں ہوئی تھی جس میں ایک ایک سورت اور ایک ایک آیت کی تفسیر مستقلاً تحریر کی گئی ہو۔

اس عہد میں ایسے علماء موجود تھے جو مختلف دیار وامصار میں گھوم پھر کر حدیثیں جمع کرتے اور تبعاً وضمناً وہ تفسیری اقوال بھی فراہم کرتے جو رسول مقبول ﷺ اور صحابہؓ وتابعین کی طرف منسوب تھے۔

ان میں مندرجہ ذیل کے اقوال قابل ذکر ہیں:

1. یزید بن ہارون السلمی — متوفی 117ھ
2. شعبہ بن حجاج — متوفی 118ھ
3. وکیع بن الجراح — متوفی 197ھ
4. سفیان بن عینیہ — متوفی 198ھ
5. روح بن عبادہ بصری — متوفی 205ھ
6. عبدالرزاق بن ہمام — متوفی 211ھ
7. آدم بن ابی ایاس — متوفی 220ھ
8. عبد بن حمید — متوفی 249ھ

تیسرے مرحلے پر پہنچ کر تفسیر، حدیث نبوی سے الگ ہو گئی اور اس نے ایک جداگانہ علم کی حیثیت اختیار کر لی، اب قرآنی ترتیب کے مطابق ہر آیت کی تفسیر مرتب کی جانے لگی ۔اس میں جن علماء نے حصہ لیا ان میں چند قابل ذکر نام حسب ذیل ہیں:

1. ابن ماجہ — متوفی 273ھ
2. ابن جریری طبری — متوفی 310ھ
3. ابو بکر بن مندر نیشاپوری — متوفی 318ھ
4. ابن ابی حاتم — متوفی 327ھ
5. ابوالشیخ بن حبان — متوفی 369ھ

6. امام حاکم متوفی405ھ

7. ابو بکر بن مردویہ متوفی410ھ

ان مفسرین کی تفاسیر سنداً نبی اکرم ﷺ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے منقول ہیں۔ ان میں تفسیر بالماثور کے سوا کوئی چیز مذکور نہیں البتہ ابن جریر طبری نے تفسیر یا قوالذکر کر کے ان کی توجیہ کی اور بعض کو راجح اور دوسروں کو مرجوح قرار دیا ہے۔[12]

6.3- تفسیر عصر تدوین کے بعد

یہاں سے تفسیر کے پانچویں مرحلہ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تفسیر کا طویل ترین تاریخی دور ہے۔ جو عباسی خلافت سے شروع ہو کر عصر حاضر تک پھیلا ہوا ہے۔ قبل ازیں تفسیر کا انحصار منقول روایات پر تھا۔ اس دور میں عقل و نقل میں امتزاج واختلاط کا آغاز ہوا۔ صرف و نحو اور عربیت سے متعلق علوم مدون ہوئے۔ فقہی مسالک منظر عام پر آئے اور کلامی مسائل نے سر اٹھایا۔ عباسی دور خلافت میں گروہی تعصب آخری حد تک پہنچ گیا۔ مختلف اسلامی فرقے اپنے مخصوص افکار و عقائد کی دعوت دینے لگے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سب علوم تفسیر کے ساتھ گھل مل گئے۔ جو شخص جس علم و فن میں کمال رکھتا تھا اس کی تفسیر اسی علم تک محدود رہ گئی۔

7- مختلف تفسیری رجحانات

قرآن حکیم کی تفسیر میں شاہ ولی اللہ کے بقول سات طرح کے رجحانات سامنے آئے ہیں:

1. تفسیر بالماثور

اس سے مراد وہ تفسیر ہے جس میں قرآن، احادیث نبویہ ﷺ یا اقوال صحابہ و تابعین سے تفسیر کی گئی ہو ان

---

[12](التفسیر و المفسرون)

مآخذ کے ساتھ تفسیر کرنا تفسیر بالماثور کہلاتا ہے۔ان کے علاوہ کسی تفسیر کو تفسیر بالماثور نہیں کہہ سکتے۔

احادیث اور اقوال صحابہ وتابعین سے منقول تفسیر کے بارے میں سندی حیثیت کو جاننا اور تحقیق کرنا انتہائی ضروری ہے اگر وہ احادیث صحیح سند سے ثابت ہوں تو ان احادیث سے تفسیر مقبول ہو گی ورنہ نہیں۔

تفسیر بالماثور کی تفاسیر میں جامع البیان فی تفسیر القرآن،بحرالعلوم،الکشف والبیان عن تفسیر القرآن،معالم التنزیل، الدرالمنثور فی تفسیر الماثور وغیرہ شامل ہیں۔

2 .کلامی تفسیر

ایسی تفسیر جس سے صرف ان آیات کی تفسیر کی جاتی ہے جن سے عقائد کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔کلامی تفسیر کہلاتی ہے۔ تفسیر القرآن میں کلامی انداز کا اضافہ عقلی اور اجتہادی افکار و نظریات کی بنا پر ہوا۔ غیر مسلموں اور بعض اسلامی فرقوں سے عقائد و نظریات کی بحث نے علم کلام کو جنم دیا اور قرآن حکیم کی بعض تفاسیر کلامی انداز میں تحریر کی گئیں۔

امام رازی کی مفاتیح الغیب اس رجحان کی نمائندہ تفسیر ہے۔

3۔ فقہی انداز میں تفسیر

قرآن مجید کی وہ آیات جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہو،ان آیات کی تفسیر فقہی تفسیر کہلاتی ہے۔

قرآن حکیم کے فقہی مسائل کی تفاسیر ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص کی احکام القرآن، عماد الدین أبو الحسن علی بن محمد بن علی طبری الکیاالہراسی کی احکام القرآن،ابن العربی مالکی أبو بکر محمد بن عبد الله اندلسی کی احکام القرآن،مقداد بن عبدالله السیوری کی کنز العرفان فی فقه القرآن شامل ہیں۔

4. لغت اور نحو کے اعتبار سے تفسیر

ایسی تفسیر جس میں قرآن مجید کے نحوی مسائل اور وجوہِ اعراب سے بحث کی جاتی ہے انہیں لغوی تفاسیر کہا جاتا ہے۔اس انداز سے أبو حیان نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں علم نحو کے مباحث کو ذکر کیا ہے۔ الکشاف عن حقائق التنزیل ابوالقاسم جارالله محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی (467ھ۔538ھ)

کی تحریر کردہ تفسیر ہے، اور ابوالخیر ناصرالدین عبداللہ بن عمربن محمد بن علی البیضاوی (م685ھ) نےانوارالتنزیل و اسرارالتاویل لکھی ہے۔

5. علم معانی وبیان کے اعتبار سے تفسیر

اس تفسیر کادار و مدار الفاظ قرآنی کا جو ظاہری معنی و مفہوم مراد ہے اس سے ہٹ کر یا ترک کر کے اپنے خیال یا فکر کے مطابق جو پوشیدہ معنی مفسر لے اسے تفسیر اشاری یا باطنی کہتے ہیں۔

جیسے محمد بن محمد بن مصطفی العمادی (898ھ - 982ھ) کی تفسیر "ارشادالعقل السلیم"۔

6. قراۃ و تجوید کے اعتبار سے تفسیر

بیضاوی اور مجمع البیان میں اختلاف قراءات سے واقع ہونے والے اختلاف معانی پر بحث کی ہے۔

7. مسائل تصوف کے اعتبار سے تفسیر

تصوف و سلوک سے منسلک حضرات صوفی کہلاتے ہیں۔ جیسے علامہ تستری کی "تفسیر القرآن العظیم"۔

ڈاکٹر محمد حسین ذھبی نے ان رجحانات پر مزید دو رجحانات کا اضافہ کیا ہے۔

1. تفسیر علمی: سائنسی معلومات اور تحقیقات کے اعتبار سے قرآن کی تفسیر مثلاً طنطاوی جوہری کی "الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم"۔
2. تفسیر الحادی : ہمارے عہد میں الحادی انداز میں کی گئی قرآن کی تفاسیر میں معجزات، حدود، تعداد ازدواج اور حرمت ربوا وغیرہ کا انکار کیا گیا ہے۔

خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 1۔ تفسیر کی تدوین وار تقاء پر جامع نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر 2۔ عہد صحابہ اور عہد تابعین کی تفسیری خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر 3۔ مختلف رجحانات کی تفاسیر کی ایک فہرست مرتب کیجیے اور ہر ایک کی نمایاں خصوصیات بھی تحریر کیجیے۔

یونٹ نمبر 3

علوم الحدیث ، سیرت و مغازی

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 51

یونٹ کے مقاصد 52

1-تاریخ تدوین حدیث 53

2-جمع وتدوین حدیث 53

2.1-عہد نبوی میں کتابت حدیث 54

2.2 -عہد صحابہ میں تدوین حدیث 56

2.3-تدوین حدیث عہد تابعین میں 56

2.4-حضرت عمر بن عبدالعزیز اور تدوین حدیث 57

2.5-تدوین حدیث تیسری صدی ہجری میں 59

2.6-تدوین حدیث چوتھی صدی ہجری میں 60

3۔علوم الحدیث 61

3.1-علم جرح وتعدیل 62

3.2-علم مختلف الحدیث 64

3.3-علم علل الحدیث 64

3.4-علم غریب الحدیث 64

3.5-علم الناسخ والمنسوخ 65

4۔سیر ومغازی 66

4.1-سیرت النبی ﷺ کی تدوین کا فن 67

4.2۔سیر ومغازی پر ابتدائی مؤلفین اور ان کی تالیفات 68

4.3سیرت النبی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر بحث 70

یونٹ کا تعارف

حضور اکرم ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو حدیث کہا جاتا ہے۔ صحابۂ کرام نے جو ہر وقت آپ کے گرد پروانوں کی طرح موجود ہوتے تھے، آپؐ کے اقوال وافعال کو بڑی احتیاط سے جمع کیا، ان کی حفاظت کی اور آئندہ آنے والی نسلوں تک انہیں پہنچایا۔

محدثین نے حدیث کی اہمیت کے پیش نظر اس علم کی جمع وتدوین میں بڑی جانفشانی سے کام لیا اور ان کو رد وقبول کرنے کا جو کڑا معیار قائم کیا اس کی نظیر کسی دوسرے علم میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ انہوں نے حدیث کے متعلقات کو علوم القرآن جیسی وسعت دے دی اور مختلف انداز میں علوم الحدیث پر کام کیا۔

علوم الحدیث کی تعداد کے بارے میں ابن ملقّن سے منقول ہے کہ وہ دو سو سے زائد ہیں۔ حاکم نیشاپوری نے علوم الحدیث پچاس، علامہ نووی اور ابن صلاح نے پینسٹھ اور علامہ جلال الدین سیوطی نے ترانوے ذکر کیے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کی سیرت نگاری کا شرف حاصل کرنا ہر مسلمان کی ہمیشہ سے آرزو رہی ہے۔

شبلی نعمانی کے بقول

> "مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے حالات وواقعات کا ایک ایک حرف اس استقصاء کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ کئے جا سکتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے افعال واقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ ﷺ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے۔"

یہ ساری کاوشیں اس لئے ہوئیں کی رسول اللہ ﷺ کے صحیح ترین اور مستند ترین حالات کی تدوین ہو سکے۔

اس یونٹ میں آپ جمع وتدوین اور علوم الحدیث میں سے اہم علوم کا مطالعہ کریں گے۔ اسی طرح سیرت ومغازی کی تدوین وارتقاء کا مطالعہ بھی کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

ہمیں امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. جمع وتدوین حدیث کے مختلف ادوار اور ان کی خصیوصیات کا جائزہ لے سکیں۔
2. علم روایت اور علم درایت کا تعارف کرا سکیں۔
3. علم جرح وتعدیل، علم ناسخ ومنسوخ اور حدیث کے دیگر علوم پر بحث کر سکیں۔
4. علوم الحدیث پر لکھی جانے والی اہم کتب کا تعارف کرا سکیں۔
5. سیرت النبی ﷺ کے آغاز وارتقاء اور تدوین کے لئے مرتب کئے گئے اصولوں کی وضاحت کر سکیں۔
6. سیرت ومغازی پر لکھی جانے والی اہم ابتدائی تالیفات سے متعارف ہونے کے بعد ان کی خصوصیات پر بحث کر سکیں۔

1-تاریخ تدوین حدیث

اسلامی شریعت کے بنیاد مصادر و مآخذ دو ہیں۔

1. کتاب اللہ
2. سنت نبوی ﷺ

یہ حقیقت ہے کہ اللہ کی کتاب میں بہت سی آیات مجمل ہیں، جیسے نماز، زکوۃ، روزہ اور حج وغیرہ، جب تک ان کی تفصیلات سامنے نہ آئیں ان کے احکام پر عمل نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن میں اسی طرح کی مجمل آیات کی ساری تفصیلات ہوتیں تو کتاب الہی کئی جلدوں پر مشتمل ایک طویل و ضخیم کتاب ہو جاتی اور اس کا حفظ و مذاکرہ مشکل ہو جاتا لہذا اللہ تعالی نے حضور ﷺ کو قرآن مجید کی تفصیلات بیان کرنے کا ذمہ قرار دیا اور فرمایا:

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ(13)

ہم نے آپ پر یہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس کی تشریح و توضیح کرتے جائیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہے۔

اس لئے ضروری تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کو محفوظ کر لیا جاتا تاکہ قرآن کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی لوگوں کے سامنے رہتی اور انہیں آنحضرت ﷺ کے اسوہ حسنہ پر چلنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی۔

2-جمع و تدوین حدیث

حضور ﷺ کو خود حدیث کی حفاظت اور روایت کا پوری طرح احساس تھا یہی وجہ تھی کہ آپؐ جب گفتگو فرماتے تو آہستہ آہستہ اور خوب وضاحت کے ساتھ ارشاد فرماتے تاکہ سننے والے کو پورا فائدہ حاصل ہو۔ ضروری باتوں کو آپ ﷺ

---

(13) (النحل:44)

تین تین مرتبہ بھی دہراتے تاکہ حاضرین خوب یاد کر لیں چنانچہ آپ ﷺ نے روایت حدیث کی ترغیب دلاتے ہوئے مختلف مواقع پر ارشادات فرمائے ہیں مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا:

نَضَّرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاهَا وَحَفِظَهَا وَبَلَّغَهَا[14]

"اللہ تعالی اس شخص کے چہرے کو رونق وتابندگی عطا کرے جس نے میری بات سنی اور یاد رکھی، یہاں تک کہ وہ بات اس شخص تک پہنچادی۔

اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ نے صحت حدیث کو قائم رکھنے کے لیے فرمایا کہ :

"جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے"۔

آغاز اسلام میں آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو کتاب حدیث سے عارضی طور پر منع فرمایا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید کے ساتھ کسی اور شے کا التباس نہ ہونے پائے۔

حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ

''مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو اور جس نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اسے چاہیے کہ اسے مٹادے۔''

لیکن جب قرآن و حدیث کی زبان میں امتیاز کا ملکہ راسخ ہو گیا تو آپؐ نے صحابہٴ کرامؓ کو حدیث لکھنے کی اجازت دے دی۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت رافع بن خدیجؓ نے حضورؐ سے احادیث لکھنے کی اجازت مانگی تو آپؐ نے فرمایا کہ ''لکھ لیا کرو۔ کوئی حرج نہیں''۔

2.1-عہد نبوی میں کتابت حدیث

عہد نبوی میں حدیث کی کتابت تین طریقوں سے ہوئی ہے :

1. وہ احادیث جو خود رسول اللہ ﷺ کے حکم سے لکھی گئیں۔
2. وہ احادیث جنہیں صحابہ نے حضور ﷺ کی اجازت سے آپ ﷺ کی مجلس میں بیٹھ کر لکھا۔

14 سنن الترمذی ت شاکر (5/ 34)

3. وہ احادیث جنہیں صحابۂ کرام نے مجلس نبوی میں سنا اور مجلس برخاست ہونے کے بعد قلم بند کیا۔

حضور ﷺ کے حکم سے لکھی گئی احادیث

رسول اکرم ﷺ نے زکوٰۃ ، صدقات اور خون بہا کے احکام پوری وضاحت کے ساتھ حضرت عمرو بن حزم کو لکھوا دیئے تھے۔ یہ تحریر ابو بکر اور حضرت عمر بن حزم کے خاندان میں موجود تھی۔

رسول اکرم ﷺ نے بعض لوگوں کو مخصوص حالات میں جو چیزیں لکھوائی تھیں وہ سب کی سب ان حضرات کے پاس محفوظ تھیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے قبیلہ جہنیہ، اہل یمن، حضرت علی اور حضرت وائل بن حجر کو مختلف احکام تحریری صورت میں دیئے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ آپ کے وہ خطوط وثائق ہیں جو آپ نے مختلف اوقات میں بادشاہوں ، قبیلوں کے سرداروں اور عام لوگوں کے نام لکھوائے اور خود ان پر مہر ثبت کی۔

وہ احادیث جو آپ ﷺ کی اجازت سے یا آپ ﷺ کی مجلس میں لکھی گئیں

صحابۂ کرام آپ ﷺ کی احادیث آپ ﷺ کی مجلس میں، آپ ﷺ کی اجازت سے قلم بند بھی کرتے تھے۔ ابو شاہ یمنی نے حجۃ الوداع کے موقع پر احادیث لکھنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ

اکتبو الِابی شاہ (ابو شاہ کے لئے لکھو)

حضرت عبداللہ بن عمر بن العاص نے نبی کریم ﷺ سے سن کر ان احادیث کا مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام انہوں نے "الصادقة" رکھا تھا۔

ان کے علاوہ بھی صحابۂ کرام یک ایسی واضح تعداد کا پتہ چلتا ہے جو احادیث لکھ کر محفوظ کرتے اور انہیں لوگوں کو سکھاتے تھے۔ جو لوگ آنحضرت ﷺ کی اجازت سے احادیث لکھا کرتے تھے ان میں سے چند ایک قابل ذکر اصحاب کے نام یہ ہیں۔

حضرت سعید بن عبادہ ، حضرت عبداللہ بن اوفی، حضرت سمرۃ بن جندب ، حضرت جبار بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو ، حضرت انس بن مالک۔ ان تمام صحابہ کے صحیفوں کے متعلق بہت کچھ مواد ملتا ہے۔

2.2 -عہد صحابہ میں تدوین حدیث

عہدہ نبوی ﷺ کے بعد ہم حافظ حدیث کے لئے کی گئی ان کوششوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو عہدہ صحابہ میں ہوئیں۔ حضرت ابو بکر صدیق کو حضور ﷺ کی ذات سے جو والہانہ لگاؤ تھا اور اظہر من الشمس ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ :

میرے والد محترم نے نبی ﷺ کی پانچ سو احادیث جمع کی تھیں۔ [15]

حضرت علیؓ کے پاس بھی حضور ﷺ کی احادیث کا ایک مجموعہ تھا جو آپ نے اپنی تلوار کی نام میں رکھا ہوا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ (جن سے ہم تک سب سے زیادہ عینی (پانچ ہزار تین سو چوہتر) (5374) احادیث پہنچی ہیں)، نے احادیث کے کئی مجموعے مرتب کئے تھے [(16)]۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پاس بھی حدیث کا مکتوب ذخیرہ موجود تھا۔ [(17)]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بیٹے عبدالرحمان کے پاس بھی احادیث کا مجموعہ تھا جس کے بارے میں وہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ وہ ان کے والد کا لکھا ہوا ہے۔ [(18)]

2.3-تدوین حدیث عہد تابعین میں

دور صحابہ کے بعد عہد تابعین میں کتابت حدیث کی سر گرمیوں میں مزید اضافہ ہو گیا اور انہوں نے احادیث کو قلم بند کرنے کا اسی طرح اہتمام کیا جس طرح صحابۂ کرام کو اپنے زمانے میں انہوں نے کرتے دیکھا اور سنا تھا۔

حضرت سعید ابن جبیر اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن عباس کے پاس جاتا تو

---

[15] (اسد الغابہ 1:5)

(16) (جامع بیان العلم وفضلہ، ۱:۷۴۱)

(17) (الجماع الاخلاق الرواوی وآداب السامع: ۱۰۰)

(18) (جامع بیان العلم وفضلہ، ۱:۷۲)

ان دونوں سے حدیث سن کر اونٹ کے کجاوے کی تختیوں پر لکھ لیتا پھر جب اترتا تو اسے لکھ لیتا۔ (19)

حضرت عامر الشعبی جو کوفے کے بلند پایہ تابعین میں سے ہیں، اپنے شاگردوں کو کتابت حدیث کی تاکید کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ جب تم مجھ سے سنو تو لکھ لو خواہ دیوار پر ہی کیوں نہ ہو۔

غرض اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتابت حدیث کے ساتھ اس درجے کے شغف کی موجودگی میں احادیث کے کتنے مجموعے کتابی شکل میں تیار ہوئے ہوں گے۔ امام زہری کے علاوہ جن کی کتابیں کئی اونٹوں کا بوجھ بنتی تھیں، دیگر کئی لوگ ہیں جن کے بارے میں تصریح کے ساتھ روایات میں آتا ہے کہ ان کے پاس احادیث کے مکتوب مجموعے موجود تھے۔ ان اُصحاب میں عروہ بن زبیر (93ھ)، خالد بن معدان الکلاعی (104ھ) ابو قلابہ عبداللہ بن زید احبر (401ھ)، حسن بصری (110ھ) مکحول شامی (110ھ)، محمد بن باقر علی بن الحسن (114ھ)، بکیر بن عبداللہ بن الاشج (117ھ)، قیس بن سعد المالکی (117ھ) اور قتادہ بن دعامۃ الدوسی (118ھ)، کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ بھی متعدد تابعین اور ان کے تلامذہ ہیں جن کے بارے میں اسماء الرجال کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس احادیث نبوی کے مکتوب ذخیرے تھے۔

صحیفہ ہمام ابن منبہ

ہمام، حضرت ابوہریرہ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ہمام بن منبہ کو احادیث رسول میں سے ایسی ڈیڑھ سو احادیث املاء کرائیں جن کا تعلق اخلاق سے تھا۔ یہ کتاب اگرچہ صحیفہ ہمام ابن منبہ کے نام سے مشہور ہے مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام "الصحيفة الصحية" تھا۔

2.4- حضرت عمر بن عبدالعزیز اور تدوین حدیث

حضرت عمر بن عبدالعزیز جب مسلمانوں کے خلیفہ بنے تو انہیں حکومتی سطح پر تدوین حدیث کا خیال پیدا ہوتا کہ اس کو عام کرنے کا انتظام کیا جائے۔ آپ نے ابو بکر محمد بن عمرو بن حزم، قاسم بن محمد بن ابی بکر اور محمد بن مسلم بن شہاب زہری

---

(19) (جامع البیان القلم، ۱:۷۲)

کو جمع حدیث کا کام سونپا۔

ابن شہاب زہری کا احادیث جمع کرنے میں شغف کا عالم یہ تھا کہ گھر گھر جاتے اور جو شخص ملتا اس سے حدیث نبوی کے بارے میں سوال کرتے۔ جوانوں، ادھیڑ عمر کے لوگوں اور بوڑھوں سے حتی کہ پردہ دار خواتین تک سے احادیث معلوم کر کے قلم بند کرتے جاتے تھے (20)۔

آپ کی انہی کوششوں کے نتیجہ میں وہ مکتوب ذخیرہ تیار ہوا تھا جس کے بارے میں آتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے کئی اونٹ درکار ہوتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان تین حضرات کے علاوہ بھی اپنے تمام گورنروں کے نام یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ

"نبی کریم ﷺ کی جو حدیث ملے اسے جمع کر لو، کیونکہ مجھے علم کے مٹ جانے اور اہل علم کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔" (21)

غرض حضرت عمر بن عبدالعزیز نے احادیث نبویہ جمع کرنے کا جو طریقہ بھی ممکن تھا وہ اختیار کیا۔

ابن شہاب زہری کی اس تالیف کے بعد تو پھر مختلف تالیفات کا تانتا بندھ گیا۔ امام زہری کی راہ پر چلتے ہوئے مختلف شہروں کے بڑے بڑے جلیل القدر محدثین تدوین حدیث کے کام میں مشغول ہو گئے چنانچہ مکہ مکرمہ میں ابن جریج نے، مدینہ منورہ میں امام مالک بن انس نے، کوفہ میں سفیان ثوری نے، شام میں امام اوزاعی نے، یمن میں معمر بن راشد نے، مصر میں لیث بن سعد نے، رے میں جمیل بن عبدالحمید نے، خراسان میں عبداللہ بن مبارک نے تدوین حدیث کے میدان میں بڑی قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ تدوین حدیث کا یوں سمجھ لیجیے یہ پہلا دور تھا جو دوسری صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا کیونکہ اس سلسلے کے آخری شخص حضرت عبداللہ بن مبارک ہیں جن کی وفات 181ھ میں ہوئی۔ اس دور میں دو قسم کی تالیفات مرتب ہوئیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں صحیح اسناد کا التزام نہیں کیا گیا بلکہ جو حدیث پہنچی، درج کر دی گئی اور دوسری قسم وہ جس میں صحت کا التزام کیا گیا مگر پھر بھی مرفوع احادیث کا الزام کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ مرسل، منقطع اور آثار صحابہ حتیٰ کہ اقوال تابعین کو بھی مرفوع احادیث کے ساتھ مخلوط رکھا گیا۔

---

(20) (تہذیب التہذیب، ۹:۴۴۹)

(21) (سنن دارمی، ۱:۱۲۶)

2.5-تدوین حدیث تیسری صدی ہجری میں

تیسری صدی ہجری میں جب تدوین حدیث کا دوسرا دور شروع ہوا تو محدثین نے ضرورت محسوس کی مرفوع احادیث کو مراسیل و آثار سے بالکل علیحدہ کر دیا جائیں چنانچہ اس دور کی تصانیف میں مرفوع احادیث کو دوسری تمام چیزوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور احادیث کو صحابہ کی ترتیب پر جمع کیا گیا۔ اس قسم کے مجموعوں کو "مسند" کا نام دیا گیا۔ بلاد اسلامیہ میں بڑے بڑے محدثین نے مسانید تالیف کیں۔ چنانچہ ابوالحسن علی بن عبیداللہ بن نصر بن عبیداللہ بن سہل ابن زاغونی بغدادی (213ھ) ، ابوالحسن مسداد بن اشاریہ بن مسرابول الاسدی البصری (150 - 228ھ / 768 - 843ء) ،اسد بن موسیٰ الاموی (212ھ) ، نعیم بن حماد الخزاعی (229ھ) ، ابو خیثمہ زہیر بن حرب (234ھ) نے مسانید تالیف کیں۔ آئمہ اربعہ میں سے امام شافعی اور امام حنیفہ کے مسند بھی موجود ہیں لیکن علماء کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں مسند خود اماموں کے تالیف کردہ نہیں بلکہ بعد میں کسی نے جمع کئے ہیں۔

پھر دوسرے آئمہ نے بھی اس طریق تدوین کو اختیار کیا، اور شاید ہی کوئی ایسا حافظ الحدیث امام ہو، جس نے احادیث نبوی پر مشتمل ایک مسند نہ لکھی ہو۔ مثلاً امام احمد بن حنبل (241ھ) اسحاق بن راھویہ (238ھ) عثمان بن ابی شیبہ (238ھ) احمد بن منیع (244ھ) ابو بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق بصری بزار (210۔ 292ھ/825۔905ء) وغیرہ۔

کچھ محدثین نے اپنی تالیفات کی ترتیب فقہی اصول پر قائم کی۔ اور فقہ کی ہر نوع سے متعلق جداگانہ ابواب قائم کیے اور ہر باب میں اس نوع کے مطابق احادیث درج کیں۔

پھر تالیف کا یہ طریقہ اختیار کرنے والوں میں بعض محدثین تو وہ ہیں جنہوں نے انہی حدیثوں کو جمع کیا جن کے صحیح ہونے سے متعلق انہوں نے اطمینان کر لیا اور بعض محدثین نے اپنی تالیفات میں یہ قید نہیں رکھی۔

تیسری صدی ہجری کی وہ مشہور کتب حدیث جن کا شمار کتب حدیث امہارت واصول میں ہوتا ہے، حسب ذیل ہیں۔

1. صحیح بخاری، مؤلفہ، امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری، (256ھ)۔
2. صحیح مسلم، مؤلفہ، امام مسلم بن حجاج قشیری، (261ھ)۔
3. سنن ابوداؤد، مؤلفہ، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث، (275ھ)۔

4. جامع ترمذی، مؤلفہ، امام ابو عیسی محمد بن عیسی الترمذی، (279ھ) ۔
5. سنن نسائی، مؤلفہ، امام احمد بن شعیب نسائی، (303ھ) ۔
6. سنن ابی ماجہ، مؤلفہ، امام محمد بن یزید ابن ماجہ، (273ھ)۔
7.

2.6-تدوین حدیث چوتھی صدی ہجری میں

صاحب مفتاح السنۃ "چوتھی صدی ہجری کی کتب سنت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ :

"مقتدمین و متاخرین روایان و حاملان حدیث کے درمیان حد فاضل تیسری صدی ہجری کا تقریباً اختتام ہے۔اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ تیسری صدی ہجری سنت کی خدمت و تحقیق اور اس کے راویوں کی تنقید کے لحاظ سے ایک نہایت مبارک صدی ہے۔ پھر ان کے بعد آنے والوں میں بجز چند ایک کے سب انہی کے خوش چین ہیں، کہ ان کی تالیفات انہی احادیث پر مشتمل ہیں، جو ان کے متقدمین نے جمع کی تھیں اور تنقید روایات میں بھی متاخرین اپنے ان متقدمین پر ہی اعتماد کرتے ہیں۔"

اس کے بعد صاحب "مفتاح السنة" نے چوتھی صدی ہجری کی چند مشہور تالیفات شمار کرائی ہیں۔جو یہ ہیں:

1. مسند ابو اسحاق بن یوسف الہنجابی 301ھ
2. مسند خوارزمی مولفہ ابو بکر احمد بن محمد 313ھ
3. مصنف الصحاوی 321ھ
4. مسند ابن جمیع محمد بن احمد 321ھ
5. سنن ابو بکر محمد بن یحیی ہمدانی شافعی 347ھ
6. مسند ابو علی حسین بن محمد الماسرجی 365ھ
7. مسند احمد جعفر محمد بن مہدی مدینی 372ھ
8. مسند ابو خفص بن شاہین عمر بن احمد بغدادی 385ھ

9. مسند محمد بن اسحاق ابوالعباس سراج			402ھ
10. مسند ابواسحاق بن نصر الرزاق			485ھ
11. صحیح المنتقی	مؤلفہ	ابن السکن سعید بن عثمان بغدادی	353ھ
12. صحیح ابن خزیمہ	مؤلفہ	ابن خزیمہ محمد بن اسحاق	311ھ
13. صحیح ابن حبان	مؤلفہ	ابو حاتم محمد ابن حبان	354ھ
14. صحیح ابو عوانہ	مؤلفہ	ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق	316ھ
15. 1. المعجم الکبیر 2. العجم الاوسط 3. المعجم الصغیر	مؤلفہم	سلیمان بن احمد طبرانی	360ھ
سنن دار قطنی	مؤلفہ	الوالحسن علی بن عمر دا قطنی	385ھ

3۔علوم الحدیث

احادیث کو سمجھنے ،ان کا مقام متعین کرنے ، مجموعہ ہائے احادیث کو مرتب و مدون کرنے کے اصول متعین کرنے ،احادیث کو پڑھنے ،پڑھانے اور ان کی ارتقائی سر گزشت اور نقد و جرح کے اصولوں کو جاننے یا احادیث کے خلاف کئے گئے اعتراضات کے جوابات دینے کے سلسلے میں جو کوششیں کی گئیں،علوم حدیث میں شمار ہوتی ہیں۔

علم حدیث کی دو قسمیں ہیں:

1. علم روایت
2. علم درایت

علم روایت میں راویوں کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے،ان کی عدالت و حفظ ، روایت کے طریقوں اور سند حدیث کے متصل یا منقطع ہونے کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔

علم درایت کسی روایت کے مطلب و مضمون کی عقلی تنقید کا نام ہے یعنی جو واقعہ بیان کیا جارہا ہے، عقلی شہادت

کے مطابق ہے یا نہیں۔ محدثین نے کسی روایت کی داخلی جانچ پرکھ (درایت) کے جو اصول بتائے ہیں، ان کے مطابق حسب ذیل صورتوں میں روایت مجروح ہو جاتی ہے اور قابل اعتماد و اعتبار نہیں رہتی۔

1. جو روایت عقل کے خلاف ہو۔
2. جو روایت اصول مسلمہ سے معارض ہو۔
3. محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔
4. قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو، اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔
5. جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی وعید ہو۔
6. معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔
7. روایت رکیک المعنی ہو اور اس میں لغویت کا شائبہ پایا جاتا ہو۔
8. جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔
9. جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو، بایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔
10. جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے، اس کے باوجود صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

علم روایت و درایت سے کئی پیدا ہوئے جن میں سے چند اہم علوم کا مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

3.1- علم جرح و تعدیل

اسلامی نقطہ نظر سے کوئی حدیث اسی وقت قابل اعتبار سمجھی جاتی ہے جب اس کی اسناد میں راویوں کا غیر منقطع سلسلہ موجود ہو، اسی لئے علمائے حدیث نے اسناد کے ناقدانہ مطالعے کی خاطر مکمل تحقیقات کیں، انہوں نے نہ صرف یہ کوشش کی کہ راویوں کے نام اور حالات دریافت کئے جائیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کسی زمانے میں تھے اور کہاں رہتے تھے اور ان میں ایک دوسرے سے ذاتی واقفیت کہاں تک تھی بلکہ یہ بھی کہ ان کی اعتباری صلاحیت اور متن

حدیث کی روایت میں ان کی قوت حافظہ، صداقت اور صحت کا جائزہ لیا جائے تاکہ یقینی طور پر پتہ چل سکے کہ ان میں سے کون کون قابل اعتماد (ثقہ) تھے۔ رجال کیبہ تنقید "جرح وتعدیل" کہلاتی ہے۔

محدثین کی ان تحقیقات کے ذریعے سے اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت احادیث کی اسناد میں آنے والے تقریباً تمام راویوں کے حالات آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر کے بقول

"مسلمان اس خصوصیت میں ممتاز ہیں کہ انہوں نے پانچ لاکھ علماء کے حالات محفوظ رکھے"۔

جرح وتعدیل ان اہم امور میں سے ہے جس کی طرف محدثین کی خاص توجہ رہی ہے اور انہوں نے اس علم میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

سب سے پہلے جنہوں نے اس علم کی باضابطہ جمع تدوین کی وہ حافظ یحیی بن سعید القطان ہیں پھر ان کے شاگردوں یحیی بن معین، علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل، اور عمر بن علی الفلاس وغیرہ کا یہ عزم جولاں گاہ بنا۔

جرح وتعدیل سے متعلق تالیف کردہ کتابوں میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

1. میزان الاعتدال	حافظ شمس الدین ذہبی	
2. تذکرہ الحفاظ	حافظ شمس الدین ذہبی	
3. لسان المیزان	حافظ ابن حجر عسقلانی	
4. معرفۃ الرجال	امام احمد بن حنبل	(241ھ)
5. کتاب الجرح والتعدیل	عبد الرحمن بن ابی حاتم الرازی	(327ھ)
6. کامل	ابن عدی	(365ھ)
7. اکمال فی اسماء الرجال	حافظ عبد الغنی المقدسی	(600ھ)
8. تہذیب الکمال	حافظ جمال الدین یوسف بن عبد الرحمن المزی	(742ھ)
9. تہذیب التہذیب	حافظ شمس الدین ذہبی	(848ھ)
10. تہذیب التہذیب	حافظ ابن حجر عسقلانی	(852ھ)

11. معانی الاخبار من رجال شرح معانی الآثار علامہ بدر الدین عینی (855ھ)

3.2- علم مختلف الحدیث

علم مختلف الحدیث میں ان احادیث سے بحث کی جاتی ہے جن میں بظاہر تناقض نظر آتا ہے۔اس علم کے ذریعے ان میں جمع و تطبیق کی کوشش کی جاتی ہے یا ایک حدیث کو راجح اور دوسری کو مرجوع قرار دیا جاتا ہے۔اس علم کے ماہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ حدیث و فقہ کا جامع ہو اور حدیث کے معانی میں مہارت کے ساتھ علم اصول کا بھی ماہر ہو۔اس موضوع پر سب سے پہلے امام شافعیؒ نے قلم اٹھایا اور آنے والے محدثین کے لئے راہ ہموار کی۔اس موضوع کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔مثلاً اختلاف الحدیث تاویل مختلف الحدیث ، مشکل الاحادیث وغیرہ۔

اس علم کی ابتدائی مشہور کتب میں امام شافعی کی ''اختلاف الحدیث''،ابو یحیی زکریا الساجی (307ھ) کی ''تاویل مختلف الحدیث''اور طحاوی کی ''مشکل الآثار''شامل ہیں۔

3.3- علم علل الحدیث

اس علم میں ان پوشیدہ اور دقیق اسباب و علل سے بحث کی جاتی ہے جن کی بناء پر کسی حدیث کی صحت میں قدح وارد ہوتی ہے،اگرچہ بظاہر اس میں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔اس موضوع پر لکھنے والوں میں امام بخاری،امام مسلم،امام ترمذی، امام احمد بن حنبل، علی ابن المدینی، أبويحيى الساجي البصري،ابو بکر احمد الخلال (311ھ) ابن ابی حاتم، علی بن عمر دار قطنی (375ھ) ،ابو عبداللہ حاکم (405ھ) ،ابن الجوزی (597ھ) اور ابن حجر عسقلانی سر فہرست ہے۔

3.4- علم غریب الحدیث

یہ علم متن حدیث کے ان مشکل اور شاذو نادر الفاظ سے بحث کرتا ہے جن کا مطلب و مفہوم قلت استعمال کے باعث واضح نہیں ہوتا۔علمائے حدیث کے نزدیک اس علم کو جاننا بھی نہایت ضروری ہے تاکہ حدیث کے مشکل اور

غریب الفاظ کو ان کے اصلی ماحول اور مفہوم کے مطابق سمجھا جا سکے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ (210ھ) نے ایک مختصر کتاب قلم بند کی۔ اس کے بعد حافظ ابو عبیدہ القاسم بن سلام الھروی (224ھ) نے "غریب الحدیث" کے عنوان سے ایک ضخیم اور جامع کتاب تصنیف کی۔ ان کے بعد ابن قتیبہ نے غریب الحدیث کے ہی نام سے اس فن پر کتاب تحریر کی۔ ابو عبید قاسم اور ابن قیتبہ کے تسامحات واغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے ابو محمد قاسم بن ثابت بن حزم العوفی السرقسطی (302ھ) نے "الدلائل فی شرح مااغفله ابو عبیده و ابن قتیبه من غریب الحدیث" لکھنا شروع کی لیکن دوران تالیف وہ فوت ہو گئے اور اس کی تکمیل ان کے والد ابو قاسم ثابت بن حزم السرقسطی (314ھ) نے کی، اس کے علاوہ ابو سلیمان محمد بن محمد بن محمد الخطابی البستی (388ھ) نے "غریب الحدیث" قاضی نور الدین ابو الثناء محمود بن احمد الہمدانی (334ھ) نے "التقریب فی علم الغریب" زمخشری (538ھ) نے "الفائق فی غریب الحدیث" ابن الاثیر (606ھ) نے "النہایة فی غریب الحدیث" اور محمد طاہر پٹنی نے "مجمع بحارالانوار" تصنیف کیں۔

3.5- علم الناسخ والمنسوخ

یہ علم ان احادیث متعارضہ سے بحث کرتا ہے جن میں تطبیق کا امکان نہ ہو۔ اس صورت میں بعض احادیث کو ناسخ اور بعض کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ حدیث ناسخ کا علم بعض اوقات آنحضرت ﷺ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"میں تمہیں زیارت قبور سے منع کرتا تھا، اب ان کی زیارت کیا کرو"۔

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"میں تمہیں قربانی کے گوشت کا تین دن سے زیادہ ذخیرہ کرنے سے منع کیا کرتا تھا، اب اس کی اجازت ہے"۔

ناسخ احادیث کا علم بعض اوقات کتب سیر و تواریخ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ علم الناسخ والمنسوخ پر لکھی جانے والی چند اہم تصانیف میں امام احمد بن حنبل کی کتاب "الناسخ والمنسوخ" اور ابو بکر محمد بن موسیٰ الحازمی (584ھ)

کی"الاعتبارفی بیان الناسخ والمنسوخ من الآثار"نہایت اہم ہیں۔

خودآزمائی نمبر1

سوال نمبر1۔ عہدِ نبوی میں کتابت حدیث کا آغاز ہو چکا تھا۔بحث کیجیے۔

سوال نمبر2۔ تیسری صدی ہجری میں لکھی جانے والی مسانید کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

4۔سیر ومغازی

رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی ابتدائے نبوت سے صحابۂ کرام کی غیر معمولی توجہ کا مرکز تھی۔خود صحابۂ کرام بھی ایک دوسرے کے ذریعے آنحضرت ﷺ کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں ہی یہ دستور ہو چکا تھا کہ جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتا تو وہ اس سے آنحضرت ﷺ کے حالات دریافت کرتا۔وہ اس کے جواب میں کسی تازہ وحی یا آپ کے کسی تازہ فرمان یا کسی تازہ واقعے کا ذکر کرتا ہے۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا آپ ﷺ کے پیروکاروں میں اپنے ہادی و پیشوا کی ذات مبارک،آپ کے اخلاق و عادت اور آپ کی زندگی سے متعلق باتیں دریافت کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔اس شوق جستجو سے رفتہ رفتہ روایات کا ایک وسیع ذخیرہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔دوسری صدی ہجری میں جب تصنیف وتالیف کا رواج ہوا تو اہل علم نے ان روایت کو قلم بند کرنا اور ان کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنا شروع کیا۔جن روایت کا تعلق عقائد وعبادات سے تھا یا جن سے فقہی احکام مستنبط ہو سکتے تھے۔ان سے علم حدیث کی کتابیں مدون ہوئی جن روایات میں حضور اکرم ﷺ کے حالات زندگی مذکور تھے ان سے فن سیرت کا سرمایہ تیار ہوا اور وہ روایات جن میں رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں ان غزوات کو تاریخی لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے اس لئے بعض اوقات "مغازی" کا اطلاق تمام فن سیرت پر ہوتا ہے۔

4.1-سیرت النبی ﷺ کی تدوین کا فن

سیرت النبی ﷺ کی تدوین کا فن حدیث ہی کی طرح روایت و درایت کے اصولوں پر قائم ہے۔ یہ درست ہے کہ سیرت نگاروں کے بارے میں محدثین کو یہ شکایت رہی کہ وہ روایت کے ساتھ درایت کے اصولوں کی پوری پابندی نہیں کرتے لیکن اس کمزوری کے باوجود سیرت کا معیاری فن انہی اصولوں کی پابندی کا تقاضا کرتا ہے۔ جو حدیث کے لئے وضع ہوئے۔ ان اصول کی تفصیل اصول حدیث کی قدیم کتب میں آئی ہے لیکن جدید زمانے کے علماء نے بھی اپنی سیرت پر کتابوں میں ان کا ذکر کر کے ان کا اطلاق بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر شبلی نعمانی کی سیرت النبی ﷺ کے مقدمے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بعد محمد حسین ہیکل کی کتاب حیاتِ محمد ﷺ کے مقدمے میں بھی یہ اصول اختیار کئے گئے ہیں۔

قدیم سیرت نگاروں کے سلسلے میں شبلی کی تنقید یہ ہے کہ محدثین نے نقد روایت کے جو اصول قائم کئے تھے ان میں سے بیشتر سیرت کی روایتوں میں نظر انداز کر دیئے گئے، کتب حدیث سے بے اعتنائی برتی گئی۔ سیرت میں قدماء نے جو کتابیں لکھیں ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں وہ انہی کے نام سے کیں اور نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم نہیں رکھا گیا اور کبھی روایت میں قیاس کو بھی شامل کر لیا گیا، خارجی اسباب کے حوالے سے روایت کو نہیں پرکھا گیا اور دلائل عقلی اور قرائن کی پروا نہیں کی گئی۔

ان بحثوں کے بعد شبلی نے سیرت نگاری میں احتیاط کے لئے محدثین کے مسلمہ فن درایت کی بنیاد حسب ذیل گیارہ اصول مرتب کئے ہیں جن کا لحاظ ہر سیرت نگار کو رکھنا چاہیے۔

1. سب سے پہلے واقعے کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں، پھر تمام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایت سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔
2. کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات واسناد کی تنقید لازم ہے۔
3. سیرت کی روایتیں باعتبار پایہ صحت، احادیث کی روایتی سے فروتر ہیں لہذا بصورت اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔
4. روایات احادیث میں اختلاف ہونے کی صورت میں ارباب فقہ کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہو گی۔

5. سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔
6. نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم ہونا چاہیے۔
7. یہ دیکھنا چاہیے کہ روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر حصہ شامل ہے۔
8. یہ بھی مد نظر رہے کہ اسباب خارجہ کا کس قدر اثر ہے۔
9. جو روایت عام وجہ عقلی، مشاہدہ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہو گی۔ لائق حجت نہ ہو گی۔
10. اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے اداء مفہوم میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی۔
11. روایات احاد کو موضع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قول کرنا چاہیے۔

4.2۔ سیر و مغازی پر ابتدائی مؤلفین اور ان کی تالیفات

سیرت نگاری پر ابتدائی کام کرنے والوں میں عروہ بن زبیر (متوفی 94ھ) اور ابن بن عثمان (متوفی 105ھ) قابل ذکر ہیں۔ مگر ان کی تصنیفات زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

مسلمانوں میں سیرت نگاری کا ذوق عہد بنو امیہ میں پیدا ہو۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام امام ابو بکر محمد بن مسلم بن شہاب زہری (متوفی 124ھ) کا آتا ہے جنہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم پر "کتاب المغازی" کے نام سے ایک تصنیف کی۔ امام زہری کی وجہ سے لوگوں میں مغازی و سیرت کی طرف رجحان بڑھ گیا۔ ان کے حلقہ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے، ان میں یعقوب بن ابراہیم، محمد ابن صالح تمار، عبدالرحمن بن عبدالعزیز، فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ "تہذیب التہذیب" وغیرہ میں ان لوگوں کا امتیازی وصف "صاحب المغازی" لکھا جاتا ہے۔

زہری کے تلامذہ میں سے دو اشخاص، موسی بن عقبہ اور محمد بن اسحاق نے مغازی و سیرت میں نہایت شہرت حاصل کی، سیرت النبی ﷺ کے مولف کے بقول یہی دو شخصیتیں ہیں جن پر اس سلسلہ کا فن ختم ہوتا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ تابعین میں سے تھے، انہوں نے اپنی تصنیف کتاب المغازی میں حسب ذیل امور کا خاص خیال رکھا:

1. مصنفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے انہوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا۔
2. عام مصنفین کی عادت تھی کہ کثرت سے واقعات نقل کر دیتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آجاتی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتب مغازی کے مختصر ہے۔
3. چونکہ روایت حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی۔اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغاز شباب ہی سے حلقہ درس میں شامل ہو جاتے تھے اور حدیثیں سن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے لیکن چونکہ اس عمر میں واقعات کا صحیح طور پر سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا اس لئے اکثر روایتوں میں تغیر یا اختلاط ہو جاتا تھا۔ موسیٰ بن عقبہ نے بخلاف اور لوگوں کے اس فن کو بڑی عمر میں سیکھا۔ یہ کتاب اب ناپید ہے۔ اس کا کچھ حصہ ایک جرمن پروفیسر زخاؤ نے شائع کیا تھا، جو اسے کسی لائبریری میں ملا تھا۔

محمد بن اسحاق امام فن مغاذی کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے "سیرت" کے عنوان سے کتاب لکھی جس کی جامعیت، تفصیل اور ملحمات کی فراوانی کی بنا پر اکثر اہل علم نے اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں۔

محمد بن عمر الواعدی نے اس فن "کتاب المغازی" تحریر کی۔ بحیثیت مورخ انہیں سیرت و مغازی میں مستند مانا جاتا ہے۔ واقدی نے اپنی کتاب میں خصوصاً واقعات کی تاریخیں متعین کرنے کا التزام کیا ہے۔ آپ کی کتاب المغازی، سیرت و مغازی کی کتب میں سے پہلی کتاب ہے جو اپنی مکمل صورت میں ہم تک پہنچی ہے۔

واقدی کے تلامذہ میں سے ابن سعد نے آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے حالات پر ایک جامع اور مفصل کتاب لکھی جو "طبقات ابن سعد" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے دو صرف آنحضرت ﷺ کے حالات پر ہیں۔ باقی دس جلدوں میں صحابہ اور تابعین کے حالات تحریر کئے گئے ہیں اور چونکہ ان کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت ﷺ کا ذکر آتا ہے اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

مغازی و سیر کی ایک اور مظہور کتاب "ذاد المعاد فی هدی خیر العباد" ہے جو حافظ ابن قیم نے تحریر کی ہے اس کتاب کی منفرد خصوصیات یہ ہے کہ اس میں صرف حالات و واقعات کے بیان پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر موقع پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فلاں قول یا عمل سے کیا احکام مستنبط ہو سکتے ہیں اور آپ کے حالات اور معمولات زندگی میں ہمارے لئے نصیحت کا کیا سامان موجود ہے۔

ان کے علاوہ سیر و مغازی کی دیگر اہم اور بنیادی کتب میں عبدالملک ابن ہشام کی"سیرت رسول اللہ ﷺ"(جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے) قاضی عیاض کی"الشفاء بتعریف حقوق المصطفی"محمد بن یحیی ابن سید الناس کی"عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر"حافظ ابن کثیر کی"السیرة النبویة"جلال الدین سیوطی کی"الخصائص الکبری"شمس الدین شامی کی"سبل الهدی فی الارشاد فی سیرة خیر العباد"(جو سیرت شامی کے نام سے مشہور ہے) شامل ہیں۔

4.3 سیرت النبی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر بحث

بعض سیرت نگاروں نے حضور ﷺ کی سیرت کے کسی خاص پہلو کو لیتے ہوئے اس پر بحث کی ہے۔ مثلاً ابو القاسم السبتی نے آپ کے مولد (جائے پیدائش) پر"الدرالمنظم فی المولد المعظم"تحریر کی ہے۔ دلائل النبوۃ پر کئی سیرت نگاروں نے کتابیں تحریر کی ہیں جن میں محدث امام ابو بکر احمد بن الحسین بیہقی کی کتاب سب سے جامع ہے۔ شمائل نبوی ﷺ پر امام ابو عیسی الترمذی کی"کتاب الشمائل"مشہور ہے۔ اخلاق نبوی ﷺ پر محمد بن ابی بکر ابن الجوزیہ نے" زاد المعاد فی هدی خیر العباد"تحریر کی ہے۔ آپ ﷺ کے موالی (آزاد کردہ غلاموں) اور کاتبوں کے حالات کو عبداللہ بن علی بن احمد بن جدیدہ نے جمع کر کے کتاب کا نام"المصباح المضی فی کتاب النبی ﷺ"رکھا۔

خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 1۔ فن مغازی و سیر کی ابتداء اور اس کے ارتقاء پر مفصل نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر 2۔ محمد بن اسحاق کی کتاب"سیرت" کا واقدی کی"کتاب المغازی"سے موازنہ کیجیے اور بتائیے کہ اسناد کے اعتبار سے ان میں سے کس کتاب کو فوقیت حاصل ہے؟

سوال نمبر 3۔ طبقات ابن سعد کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

یونٹ نمبر 4

اصولِ فقہ اور فقہ

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 73

یونٹ کے مقاصد 74

1 -اصول فقہ کی تعریف 75

2-علم اصول فقہ کا آغاز 76

3-تدوین اصول فقہ 76

4-علم الفقہ کی تعریف 79

5-فقہی اختلاف کے اسباب 79

6-فقہ کا تاریخی ارتقاء 80

7-فقہائے اربعہ کی فقہی اسالیب 81

7.1-امام ابو حنیفہ کا فقہی اسلوب 81

7.2-امام مالک کا فقہی اسلوب 82

7.3-امام شافعی کا فقہی اسلوب 83

7.4-امام احمد بن حنبل کا فقہی اسلوب 84

8-مسالک اربعہ کی اہم بنیادی تالیفات 85

8.1-فقہ حنفی کی بنیادی کتب 85

8.2-فقہ مالکی کی بنیادی کتب 86

8.3-فقہ شافعی کی بنیادی کتب 87

8.4-فقہ حنبلی کی بنیادی کتب 88

یونٹ کا تعارف

اسلامی تہذیب کا ایک درخشاں پہلو اس کا علمی تہذیب کا ہونا ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ قدیم علوم وفنون کو نئی زندگی دی بلکہ کئی علوم وفنون کا آغاز بھی انہیں کے ہاتھوں ہوا۔ مسلمانوں نے انہیں ترقی دی اور عروج وکمال کے اس معیار تک پہنچایا جہاں ان میں مزید کسی اضافے کی ضرورت اس کے دور کے لحاظ سے باقی نہ رہی۔

اصولِ فقہ بھی مسلمانوں کا ایسا ہی فن ہے جس کو مسلمانوں کے عروج وکمال اور توسیع وتنوع کے جس مقام پر پہنچایا ہے مغرب کا جیوریس پروڈنس (Juris Prudence) اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں فقہ سے متعلق جملہ امور آپ ﷺ کی ذات مبارک سے وابستہ تھے۔ قانون سازی، فتاویٰ، فیصلے وغیرہ کے فرائض آپ ﷺ خود بنفس نفیس انجام دیا کرتے تھے۔ فقہ کی نہ باقاعدہ ترتیب وتدوین ہوئی تھی اور ضروریات زندگی محدود ہونے کی بناء پر اس کی ضرورت تھی لیکن بعد کے ادوار میں فتوحات کی کثرت اور مختلف تمدنوں سے سابقہ کی وجہ سے اس دور میں نئے نئے سیاسی واجتماعی مسائل ابھر آئے۔ حالات وزمانہ کے تقاضوں کی نئی نئی کروٹوں نے اجتماعی مسائل حل کرنے کے لئے نئے نئے زاویۂ نگاہ پیدا کر دیئے۔ لازمی طور پر پہلے دور کا جو مجموعہ موجود اور سینوں میں محفوظ تھا اس کو اس حد تک وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ موجودہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کسی اور روشنی سے استفادہ کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی چنانچہ فقہی مسائل کی تدوین ہونے لگی اور فقہی اجتہاد کے لئے کتاب وسنت کی روشنی میں ذرائع ووسائل اور اصول وقواعد مقرر کئے۔ اس بناء پر بآسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقہ اسلامی دراصل "فقہ القرآن والسنۃ" ہی ہے۔ کیونکہ یا تو وہ ان دونوں مآخذوں سے واضح طور پر ماخوذ ہوگی یا ان دونوں پر محمول ہوگی یا ان معانی پر محمول ہوگی جو کتاب وسنت کا مقصود ہوں گے لہذا اسی طرز پر فقہ اسلامی کی بنیاد پر قائم ہوئی اور اس کی زمانہ مابعد میں تدوین عمل میں آئی۔

اس یونٹ میں آپ اس علم کی ابتداء اور اس کی تدوین کا مطالعہ کریں گے اور فقہ اسلام کے تاریخی ارتقاء، فقہا کے فقہی اسلوب اور اس علم پر بنیادی تالیفات کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

ہمیں امید ہے کہاس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. یہ بیان کر سکیں کہ علم اصول فقہ اور فقہ کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس کا آغاز کب ہوا۔
2. اس فن کے ارتقاء میں علماء اصولیین کی خدمات کا جائزہ لے سکیں۔
3. اصول فقہ پر لکھی جانے والی اہم ابتدائی کتب کا تعارف کرا سکیں۔
4. تبصرہ کر سکیں گے کہ فقہی اختلافات کے اسباب اور ان کی نوعیت کیا تھی۔
5. ائمہ مجتہدین کے فقہی اسلوب اور ان کے امتیازات پر گفتگو کر سکیں۔
6. مسالک اربعہ پر لکھی گئی بنیادی تالیفات کو واضح کر سکیں۔

1 - اصول فقہ کی تعریف

علماءاصول نے اصولِ فقہ کی تعریف یوں کی ہے:

"هوعلم بقواعد يتوصل بها الى استنباط الاحكام الفقهية عن دلائلها"-

اصول فقہ ایسے کلی اصول کا علم ہے کہ ان کے ذریعے دلائل شریعہ سے قوانین کے استنباط کا طریقہ معلوم ہو۔

عہدِ نبوی ﷺ میں شرعی احکام کے حصول کی شکل یہ ہوتی تھی کہ نبی ﷺ پر قرآن کی جو وحی نازل ہوتی آپ ﷺ اس کی قول و فعل سے وضاحت فرمادیتے اور ایک حکم شرعی بتادیتے۔اس میں سب مسلمانوں کو نہ عقل و نقل کی ضرورت پیش آتی، نہ نظر و قیاس کی۔ لیکن حضور ﷺ کی وفات کے بعد اگرچہ براہِ راست نبوت سے اکتساب ناممکن ہو گیا؟ مگر اب مسلمانوں کے پاس قرآن حکیم مکمل طور پر موجود تھا جسے بے شمار صحابہ نے حفظ بھی کر لیا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم سے شرعی احکامات معلوم کئے جانے لگے۔

سنت نبوی ﷺ کے بارے میں صحابۂ کرام کا اجتماع ہے کہ اگر وہ ہم تک ایسے طریق سے پہنچی جس کے صدق پر ہمارا ظن غالب ہو تو وہ واجب العمل ہے۔

اجماع صحابہ بھی قرآن و سنت کے قائم مقام ہوتا ہے کیونکہ اجماع صحابہ ظاہر ہے کسی معقول دلیل شرعی کی بناپر ہو سکتا ہے اور جب صحابۂ کرام کی عظمت ثابت ہے تو اس بات کا امکان نہیں ہے کہ وہ بغیر دلیل کے کسی امر پر اتفاق کر لیں۔

اس کے ساتھ ساتھ صحابہ اور بعد کے سلف صالحین اشیاء کو اشیاء پر اور امثال کو امثال پر قیاس کیا کرتے تھے جسے سب مانتے تھے۔ کیونکہ بہت سے ایسے واقعات آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد رونما ہوئے جن کے بارے میں قرآن و سنت خاموش تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان نئے پیش آمدہ مسائل کا الحاق ایسے مسائل سے کیا جو بالوضاحت قرآن و سنت میں موجود تھے۔اس الحاق کے سلسلے میں یہ شرط ملحوظ رکھی گئی کہ دونوں مسائل میں باہم مماثلت یا مشابہت کی بنا پر ایسی مساوات قائم ہو کہ یہ گمان غالب ہو جائے کہ دونوں کے باب میں حکم الٰہی ایک ہی ہے۔ یہ صورت قیاس کی ہے جس کا شمار بھی ادلہ شرعیہ میں ہوتا ہے۔

2- علم اصول فقہ کا آغاز

اصول فقہ کا علم ابتدائی ادوار میں نہیں تھا کیونکہ ہمارے اسلاف اس سے بے نیاز تھے۔ انہیں قرآن وسنت کی نصوص کے معانی اخذ کرنے کے لئے اپنی فطری قدرت کلامی سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ احکام الٰہی کے استنباط کے لئے جن جن اصولوں کی اب ضرورت پیش آتی ہے، وہ ان پر روشن تھے۔ اسی طرح وہ احادیث کی اسناد پر غور وخوض کرنے کے بھی حاجت مند نہ تھے کیونکہ رواۃ حدیث یا تو ان کے ہم عصر تھے یا قریب العصر۔ یوں راویوں کے حالات ان کے سامنے آئینہ کی طرح روشن تھے لیکن جب سلف کا دور گزر گیا اور صدر اول ختم ہوا تو فقہاء اور مجتہدین نے ضروری ضروری قواعد اور قوانین کو ضبط کرنے کی ضرورت محسوس کی تاکہ ان کی روشنی میں ادلہ شرعیہ سے احکام کا استنباط کیا جاسکے۔ انہوں نے ان اصول و قواعد کو ایک مستقل فن کی شکل میں مدون کیا جس کا نام اصول فقہ قرار پایا۔

3- تدوین اصول فقہ

علامہ ابن خلدون اصول فقہ کی تدوین کے بارے میں مقدمہ ابن خلدون میں لکھتے ہیں:

"اصول فقہ پر سب سے پہلے امام اعظم نے قلم اٹھایا اور اپنا مشہور رسالہ "الرسالۃ" قلم بند کیا۔ جس میں اوامر و نواہی، بیان و خبر، نسخ اور علۃ القیاس کے حکم وغیرہ پر بحثیں کیں، پھر فقہائے حنیفہ نے المبسوط کتابیں تالیف کیں، جن میں اصول فقہ کے قواعد و ضوابط وضاحت و تفصیل کے ساتھ مقرر و مدون کئے اور دوسری طرف متکلمین نے بھی اسی طرح کی کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن فقہاء کی تحریریں فقہ سے زیادہ ربط اور استنباط فروع کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی تھیں، کیونکہ ان کی کتابوں میں فروعی مسائل کی مثالیں اور ان کے شواہد کی کثرت ہے اور فقہی نکتوں پر مسائل کی بنیادیں استوار ہیں، بخلاف متکلمین کے، کہ انہوں نے فقہی مسائل سے صرف نظر کر لیا اور زیادہ تر عقلی استدلال کی طرف ان کا میلان رہا، جو ان پر ان کے اپنے فن کے غلبہ کا نتیجہ اور ان کے اپنے طرز بحث و کلام کا تقاضا تھا"۔

غرض فقہائے حنفیہ کو فقہی باریکیوں پر دسترس اور مسائل فقیہہ سے اصول فقہ کے قواعد و قوانین اخذ کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے، چنانچہ ابوزید دبوسی نے جو آئمہ احناف سے تھے قیاس کے باب میں ایک جامع کتاب لکھی، جس میں انہوں نے ان ساری بحثوں اور شرائط کو پوری طرح قلمبند کیا ، جن کی اس علم میں ضرورت پیش آتی ہے، اور اصول فقہ کی صناعت پایہ تکمیل کو پہنچی اور اس کے سارے مسائل کی تہذیب اور اس کے قواعد کی ترتیب عمل میں آئی۔

متکلمین کے طریقہ پر جو تصنیفات کی گئیں ان میں اشاعرہ میں سے امام الحرمین کی "البرہان" اور امام غزالی (متوفی 505ھ) کی "مستصفی" اور معتزلہ میں سے عبدالجبار کی "کتاب العہد" اور ابوالحسین بصری کی "المعتمد شرح کتاب العہد" سب سے بہترین کتابیں شمار کی جاتی ہیں اور ان چاروں کتب کو ان فن کے ارکانِ اربعہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد متاخرین متکلمین میں سے دو فضلاء نے ان چاروں کتب کی تلخیص کی اور وہ ہیں امام فخر الدین (رازی) ابن الخطیب اور ان کی کتاب کا نام "المحصول" ہے، اور دوسرے میں سیف الدین آمدی جن کی کتاب کا نام "الاحکام" ہے لیکن انداز تحقیق اور اسلوب بحث کے لحاظ سے دونوں آئمہ کی راہیں جدا ہیں، امام فخر الدین کے یہاں استدلال و حجت کی فراوانی ملتی ہے اور آمدی نے تحقیق مذاہب اور تفریع مسائل پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

پھر "المحصول" کی تلخیص (امام فخر الدین کے شاگرد) امام سراج الدین ارموی نے کی، جس کا نام "التحصیل" ہے، اور سراج الدین ارموی نے بھی "المحصول" کی تلخیص کی، جس کا نام "الحاصل" ہے۔ پھر شہاب الدین قرافی[22] نے ان دونوں کتب (تحصیل اور حاصل) سے مقدمات اور قواعد اخذ کر کے ایک مختصر سی کتاب تیار کی جس کا نام "تنقیحات" ہے، اسی طرح بیضاوی نے قرافی کی روش اختیار کی اور اپنی کتاب "المنہاج" تالیف کی پھر یہی دونوں کتابیں (تنقیحات اور منہاج) مبتدی طلبہ کے نصاب درس میں آئیں اور بہت سے لوگوں نے ان دونوں کی شرحیں لکھیں۔

---

[22] امام قرافی کا پورا نام مع نسبت یوں ہے: امام شہاب الدین ابوالعباس احمد بن ابی العلاء ادریس بن عبدالرحمن بن عبداللہ بن یلّینالقرافی مصری مالکی۔

رہی آمدی کی کتاب الاحکام، جو تحقیق مسائل کے لحاظ سے بڑی خوبیاں رکھتی ہے وہ اس کی تلخیص ابو عمرو بن الحاجب نے کی جو "المختصر الکبیر" کے نام سے مشہور ہے، پھر اپنی اس تلخیص کا بھی خلاصہ ایک دوسری کتاب کی شکل میں کیا، جو اس فن کے طلبہ میں متداول ہو گیا اور مشرق و مغرب میں عام طور پر مقبول ہوا، اور زیر مطالعہ رہنے لگا اور اس کی شرحیں کی گئیں۔ یہ ساری تلخیصات ہیں جن میں متکلمین کے طرق بحث اور اسالیب استدلال کا نچوڑ آ گیا ہے۔

فقہائے احناف کی کتابوں اور ان کے طریق تصنیف کا جہاں تک تعلق ہے، تو اس فن میں ان کی بکثرت اچھی اچھی کتابیں ہیں، جن میں سے متقدمین کی تصنیفات میں سے بہترین ابو زید دبوسی کی تصنیف ہے جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے اور متاخرین کی تصانیف میں سے سیف الاسلام بزدوی کی کتاب ہے جو آئمہ احناف میں سے تھے اور جنہوں نے اپنی کتاب میں مسائل کا نہایت خوبی سے استیعاب کیا ہے، پھر فقہائے حنفیہ میں سے ابن الساعاتی آتے ہیں اور انہوں نے آمدی کی "الاحکام" اور کتاب البزدوی دونوں کو جمع کر کے بہترین ترتیب و تہذیب کے ساتھ "البدائع" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جو واقعی اسم با مسمیٰ ہے، کیونکہ وہ اپنی ترتیب و تدوین میں اور اپنی تحقیقات اور اسلوب بیان میں ندرت و جدت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اس زمانے تک وہی متداول ہے، وہی پڑھی پڑھائی جاتی ہے اور زیر بحث رہتی ہے اور بہت سے علمائے عجم نے اس کی شرحیں لکھ کر اس کے محاسن کو اجاگر کیا ہے۔

خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1۔ اصول فقہ کی تعریف چار مختلف علماء اصول کے حوالے سے کیجیئے۔

سوال نمبر 2۔ علم اصول فقہ کا ارتقاء کس طرح ہوا؟

سوال نمبر 3۔ اصول فقہ کی تدوین کے کون سے طریقے اب تک متداول چلے آ رہے ہیں؟

4- علم الفقہ کی تعریف

فقہ مکلفین کے بارے میں احکام الٰہی کا اس حیثیت سے جاننے کا نام ہے کہ وہ واجب ہیں یا مندوب، مباح اور مکروہ ہیں یا حرام۔ یہ احکام قرآن وسنت اور ان ادلہ شرعہ سے ماخوذ ہوتے ہیں جنہیں شارع نے معرفت احکام کے لئے مقرر کیا ہے۔ ان ادلہ سے جن احکام کا استخراج ہوتا ہے انہیں فقہ کہتے ہیں۔ نورالانوار میں فقہ کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"العلم بالا حکام الشرعیۃ عن ادلتھاالتفصیلیۃ"

"فقہ ، شرعی قوانین کے علم کا نام ہے جو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل ہو"۔

5- فقہی اختلاف کے اسباب

حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے لگا تو اکثر ایسے مسائل پیش آنے لگے جن میں اجتہاد واستنباط کی ضرورت پڑتی گئی اور قرآن وحدیث کے اجمالی احکام کی تفصیل کی طرف اہل علم کو متوجہ ہونا پڑا۔ مثلاً کسی نے غلطی سے نماز میں فرض ترک کر دیا تو یہ بحث پیش آئی کہ نماز ہوئی یا نہیں۔

اس بحث کے پیدا ہو جانے کے بعد تو ممکن نہیں تھا کہ نماز میں جس قدر اعمال تھے سب کو فرض کہہ دیا جاتا اس لئے صحابہ کو تفریق کرنا پڑی کہ نماز کے یہ افعال فرض ولازم ہیں جن کا ترک نماز کو باطل کر دیتا ہے، یہ افعال سنت ہیں جن کا ترک موجب کراہت ہے اور یہ امور مستحب ہیں جن کا چھوٹنا موجب خلل نہیں وغیرہ۔

چنانچہ فقہ کے لئے جو اصول قرار دیئے جا سکتے تھے ان پر تمام صحابہ کا اتفاق ناممکن تھا اس لئے مسائل میں اختلاف پیدا ہو گئے اور صحابہ کی راہیں مختلف ہو گئیں۔ بہت سے ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کا عہد نبوی میں پتہ اور نشان ہی نہ تھا، ایسی حالت میں اہل علم کو استنباط و قیاس سے کام لینا پڑا۔ چونکہ استنباط احکام کے اصول یکساں نہ تھے اس لئے اختلاف کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اس کے علاوہ بعض مسائل میں اہل علم صحابہ کا منصوص علم بھی مختلف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عہدہ نبوی میں دین کی تکمیل رفتہ رفتہ ہوئی اور احکام میں حسب موقف تغیر و تبدیل بھی ہوتا گیا۔ اس لئے

تمام صحابہ کو ہر کام کا علم ہونا مشکل تھا کیونکہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ہر وقت تمام صحابہ موجود نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ صحابۂ کرام نے جیسا سنا اور دیکھا اسے اپنا معمول بنالیا، اس وجہ سے بھی اختلاف ناگزیر تھا۔

عہد صحابہ وتابعین میں مسائل میں اختلاف آراء کے چند اہم اسباب کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

1. قرآن وحدیث کے الفاظ کے معانی سمجھنے میں اختلاف
2. صحابہ کے منصوص علم میں اختلاف
3. طریق استنباط میں اختلاف

ابتداء میں یہ اختلافات معمولی نوعیت کے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور تدوین فقہ کی سخت ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

6- فقہ کا تاریخی ارتقاء

صحابہ سب کے سب صاحبِ فتویٰ نہیں تھے اور نہ ان سب سے دین کا تفصیلی علم حاصل کیا جاتا تھا۔ جن صحابہ سے علوم دین کا اکتساب کیا جاتا تھا انہیں حاملین قرآن کہتے تھے، جو قرآن کے ناسخ ومنسوخ، اس کے متشابہ اور محکم اور اس کے تمام دلائل سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے یا تو نبی ﷺ سے براہ راست تعلیم وتربیت حاصل کی تھی یا ان جلیل القدر صحابہ سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ جنہوں نے براہ راست نبی کریم ﷺ سے تعلیم پائی تھی ان حاملینِ قرآن کو "قراء" کہا جاتا تھا۔ عرب اس وقت عام طور پر امی تھے اس لئے ان میں سے جو قرآن کا قاری ہوتا وہ ابھر کر سامنے آجاتا تھا۔

صدر اسلام میں یہی صورت حال رہی، پھر اسلامی مملکت میں وسعت ہوتی گئی اور عرب سے جہالت کا خاتمہ ہوتا گیا، لوگ کتاب الٰہی میں مہارت حاصل کرتے گئے اور استنباط کا ملکہ فروغ پانے لگا۔ یہاں تک کہ فقہ نے تکمیل پاکر ایک مستقل علم وفن کی شکل اختیار کرلی۔ اب "قراء" کا لفظ فقہاء اور علماء سے بدل گیا، اور فقہ کی دو شاخیں ہوگئیں۔ اہل عراق نے کثرت کے ساتھ قیاس سے کام لیا جس میں انہیں بصیرت اور مہارت تامہ حاصل تھی۔ اس لئے انہیں "اہل الرائے" کہا جاتا تھا۔ اہل الرائے کی وہ جماعت جس میں ایک مستقل فقہی مذہب نے نشوونما پائی اور پھر ایک باقاعدہ فقہی مذہب رواج پذیر ہوا، اس کے سربراہ وپیشوا امام ابو حنیفہؒ تھے دوسرا طریقہ، طریقہ اہل حدیث کے نام

سے معروف تھا اس طریق فقہ کے رہنما امام مالک بن انسؒ تھے۔

7- فقہائے اربعہ کی فقہی اسالیب

7.1 امام ابو حنیفہ کا فقہی اسلوب

امام صاحب اپنے طریقے استنباط کے بارے میں خود فرماتے ہیں۔

"میں سب سے پہلے قرآن مجید پر نظر ڈالتا ہوں اور اگر اس میں حکم مل جائے تو اس پر عمل کرتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کوئی حکم نہ ملے تو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ سے ان روایات کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ذریعے ہم تک پہنچیں اور اگر اللہ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ میں بھی وہ حکم نہ ملے تو پھر میں صحابۂ کرام کے اقوال میں سے کسی کا قول لیتا ہوں اور پھر میں اس صورت میں ان کے اقوال سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ پھر جب ابراہیم ، شعبی، حسن، ابن سیرین اور سعید بن المسیب کی نوبت آتی ہے تو پھر جیسے انہوں نے اجتہاد کیا میں بھی ایسے ہی اجتہاد کرتا ہوں"۔

مسلک ابو حنیفہ کے یہ سب سے بنیادی اور اہم اصول ہیں دوسرے فروعی اور ثانوی اصول بھی ہیں جو انہی اصول کی بنیاد پر قائم اور انہی سے نکلے ہوئے ہیں اور جو دوسرے مسالک کے بعض اصول سے مختلف ہیں۔ چند اصول و ضوابط یہ ہیں:

1. لفظ کی دلالت خاص کی طرف قطعی ہے۔
2. عموم کے خلاف صحابی کے مسلک سے اس کی تخصیص ہو جاتی ہے۔
3. کثرت راوۃ مفید ترجیح نہیں۔
4. مفہوم شرط وصفت معتبر نہیں۔

مفہوم صفت:

کسی صفت سے متصف لفظ کا ایسا حکم بتلانا کہ صفت نہ پائے جانے کی صورت میں بیان کردہ حکم کی نقیض ثابت

ہو جائے۔ جیسے قرآن حکیم میں ہے: وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ[23] (اور تمہارے حقیقی بیٹوں کی بیویاں)۔اس آیت میں اپنے الفاظ کے لحاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ حقیقی لڑکے کی بیوی اس کے باپ پر حرام ہے اور اس کا مفہوم صفت یہ ہے کہ متبنیٰ (گود لیا ہوا) کی بیوی اس کے باپ پر حرام نہیں اس لئے کہ وہ اس کے صلب سے نہیں۔

5. عموم بلوی میں خبر واحد مقبول نہیں۔

عموم بلویٰ: فقہاء کی زبان عموم بلویٰ سے ایسی چیزیں مراد ہیں جن سے بچنا مشکل یا محال ہو۔(جیسے سڑک کی کیچڑ پر نالوں کا پانی پرندوں کا بیٹ کرنا، یا اس طرح کے جانوروں کے اڑنے اور پھڑ پھڑاتے وقت کپڑوں پر پیشاب کے چھینٹے پڑنا، گھروں میں بلیوں کا گھومنا پھرو غیرہ)۔

6. قرینہ صارفہ نہ ہو تو امر قطعی طور پر وجوب کا متقاضی ہے۔

7. فقید راوی کا اپنی روایت کے خلاف عمل ہو تو روایت نہیں بلکہ اس کی رائے پر عمل ہو گا۔

8. خبر واحد اور قیاس جلی کا تعارض ہو تو قیاس جلی مقدم ہو گا۔

9. بوقت ضرورت قیاس کو چھوڑ کر استحسان قبول کر لیا جائے گا۔

امام ابو حنیفہ سے منقول ہے:

"ہمارے علم نے یہی راہ دکھائی جو ہمارے غور و فکر اور اندازے کے مطابق سب سے بہتر ہے اور اگر کوئی اس سے بھی بہتر چیز لائے تو ہم اسے قبول کر لیں گے۔"

7.2-امام مالک کا فقہی اسلوب

امام مالک کا اپنا ایک الگ طرز فکر ہے آپ دبستان سعید بن مسیب کے حجازی مسلک سے وابستہ ہیں۔آپ کے مسلک کے اصول وضوابط کا خلاف اور ان کی ترتیب درج ذیل ہے:

1. نص : یعنی کتاب اللہ

---

[23] النساء: 23

2. ظاہر نص: یعنی عموم
3. دلیل نص: یعنی مفہوم مخالف
4. مفہوم نص: یعنی مفہوم موافق
5. تنبیہ نص: یعنی نص کا علت کی طرف اشارہ

قرآن حکیم سے اخذ کردہ یہ پانچ اصول ہیں۔ حدیث وسنت سے بھی دس اصول ماخوذ ہیں۔

1. اجماع
2. قیاس
3. عملِ اہل مدینہ
4. استحسان
5. ذرائع کے سد باب کا حکم
6. مصالح مرسلہ
7. قول صحابی (جب کہ صحابی مشہور وممتاز ہو اور روایت کی سند صحیح ہو)
8. رعایت اختلاف (مخالف کی دلیل جب قوی ہو)
9. استصحاب
10. سابقہ شریعتیں

7.3-امام شافعی کا فقہی اسلوب

امام شافعی نے "الرسالہ" میں اجمالاً مسلک شافعی کے اصول و قواعد تحریک فرمائے دیئے ہیں۔ یہ کتاب اسلام میں علم اصول پر پہلی جامع کتاب سمجھی جاتی ہے۔

آپ کے بیان کردہ چند اہم اصول حسب ذیل ہیں:

"قرآن وسنت بنیادی اصول ہیں۔ اگر ان میں حکم نہ ملے تو ان میں موجودہ احکام کی روشنی میں قیاس

کیا جائے۔ اگر رسول اللہ ﷺ سے متصل صحیح الاسناد حدیث ہو تو کافی ہے۔ اجماع خبر واحد سے بڑی چیز ہے۔ حدیث کا ظاہری مفہوم لیا جائے گا اگر حدیث نبوی میں کئی معانی کا احتمال ہو تو اسے لیا جائے گا جو اظہار سے قریب تر ہو۔ کئی احادیث ہوں تو صحیح الاسناد حدیث قابل ترجیح ہو گی۔ حدیث منقطع صرف ابن مسیب کی لی جا سکتی ہے"۔

7.4- امام احمد بن حنبل کا فقہی اسلوب

مسلک امام احمد بن حنبل کے اصول و قواعد مسلک امام شافعی کے مذکورہ قواعد سے بہت قریب ہیں ان کے اخذ واستنباط کی ترتیب یہ ہے:

1. نصوص قرآن و سنت۔ ان کی موجودگی میں کوئی دوسری چیز قابل توجہ نہیں۔ حدیث صحیح مرفوع پر عمل اہل مدینہ، رائے، قیاس، قول صحابی کا اجماع جو علم بالمخالف پر قائم ہو مقدم نہیں کیا جا سکتا۔
2. اگر کوئی نص نہ ہو تو صحابۂ کرام کے فتاویٰ دیکھے جائیں گے اگر کسی کا قول مل جائے اور اس میں صحابہ کے کسی اختلاف کا عمل نہ ہو تو اسے لیا جائے گا۔ اس پر کسی عمل، رائے اور قیاس کو مقدم نہ کیا جائے گا۔
3. صحابۂ کرام کا اختلاف ہو تو اسے اختیار کیا جائے گا جو کتاب و سنت سے زیادہ قریب ہے اور اگر کتاب و سنت سے قریب تر مسئلہ کی وضاحت نہ ہو سکے تو کسی قول پر جزم و یقین کئے بغیر اختلاف کا ذکر کر دیا جائے گا۔
4. حدیث مرسل و ضعیف کے خلاف کوئی دوسری حدیث، قول صحابی یا اجماع نہ ہو تو اسے ہی لیا جائے گا اور قیاس پر یہ حدیث مقدم ہو گی۔
5. گزشتہ دلائل میں سے کچھ نہ ملے تو بوقت ضرورت قیاس کو دلیل بنایا جا سکتا ہے۔
6. سدّ ذرائع۔

سد ذرائع: لغت میں ذریعہ ایسے وسیلہ کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری چیز تک پہنچا جائے خواہ وہ حسی ہو یا معنوی، خیر ہو یا شر۔ اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں جو ایسی ممنوع چیز تک پہنچائے جس میں فساد اور برائی پائی جائے۔

8- مسالک اربعہ کی اہم بنیادی تالیفات

8.1-فقہ حنفی کی بنیادی کتب

امام ابو حنیفہ نے اپنی فقہی مسالک پر کوئی کتاب مدون نہیں کی۔ بلکہ ان کے مسلک کو ان کے شاگردوں نے کتابوں کی شکل میں مدون کیا۔

آپ کے سب سے مشہور شاگرد امام ابو یوسف نے فقہ پر کئی کتابیں تصنیف فرمائی تھیں۔ مگر آپ کی تین کتب "کتاب الخراج"، "کتاب الآثار"اور"اختلاف ابی حنیفه و ابن ابی لیلی"کے علاوہ باقی کتب ہم تک نہیں پہنچیں۔

امام ابو حنیفہ کے دوسرے مشہور ترین شاگرد امام محمد بن حسن الشیبانی ہیں۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نو سو نوے کتابیں دینی علوم پر تحریر کیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے چند یہ ہیں۔

1۔ مبسوط 2۔ الجامع الکبیر 3۔ الجامع الصغیر

4۔ السیر الکبیر 5۔ السیر الصغیر 6۔ کتاب الزیادات

آپ کی یہ چھ کتب ظاہر الاویۃ اور اصول کہلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے کتاب الآثار، الموطا، رقیات، ہارونیات اور جرجانیات کے نام سے بھی کتابیں لکھیں ہیں۔

آپ کے ایک شاگرد حسن بن زیاد نے"کتاب المجرد، کتاب القاضی ، کتاب الخصال، کتاب الخراج، کتاب الفرائض اور کتاب الوصایا"کے نام سے بھی کتب تصنیف کی ہیں۔

تیسری صدی ہجری میں احمد بن عمر خصاف نے فقہ حنفی پر مشہور کتاب"الاسفاف فی احکام الأوقاف"تحریر کی۔

چوتھی صدی ہجری میں مشہور حنفی فقیہ احمد بن محمد طحاوی نے"معانی الآثار"اور"مشکل الآثار"کے عنوان سے کتب تحریر کیں۔

پانچویں صدی ہجری میں احمد بن قدوری نے"مختصر القدوری"اور محمد بن احمد ابو بکر سرخسی نے شرح

السیر الکبیر جو "مبسوط" کے نام سے مشہور ہے تصنیف کیں۔

چھٹی صدی ہجری میں ابو بکر بن مسعود کاسانی نے "البدائع" حسن بن منصور قاضی خان نے "فتاویٰ قاضی خان"، "شریح الجامع الصغیر" اور "شرح الزیادات" جب کہ علی بن ابی بکر مرغینانی نے "ھدایه شرح بدلیته المبتدی" تصنیف کیں۔

ساتویں صدی ہجری میں افتخار الدین عبدالمطلب بن الفضل نے "شرح الجامع الکبیر" اور محمود بن احد جمال الدین الحصیری نے "شرح الجامع الکبیر" اور "شرح السیر الکبیر" تحریر کیں۔

آٹھویں صدی ہجری میں عبداللہ بن احمد النسفی نے "کنزالدقائق" کے نام سے فقہ میں اور "المنار" کے عنوان سے اصول فقہ میں کتابیں تصنیف کیں۔

نویں صدی ہجری میں ابن الھمام نے اصول فقہ میں "التحریر" اور زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم نے "البحرالرائق" اور "الاشباہ و النظائر" تصنیف کیں۔

8.2-فقہ مالکی کی بنیادی کتب

فقہ مالکی کی بنیادی کتب میں امام مالک کی کتاب "الموطا" ہے۔

اس کے علاوہ دیگر کتب میں ابد بن الفرات کی کتاب "الاسعدیه" محمد بن سحنون کی "المدونه" محمد بن عبداللہ الحکم کی "احکام القرآن"، "کتاب الوثائق والشروط"، "کتاب اداب القضاء" اور "کتاب الدعویٰ والبینات" شامل ہیں۔

یہ کتب تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں۔

چھٹی صدی ہجری میں ابوالولید محمد بن احمد بن رشد نے "بدایة المجتہد" کے عنوان سے کتاب تصنیف کی۔

نویں صدی ہجری میں محمد بن محمد بن عرفہ نے "المبسوط" اور محمد بن یوسف الاندلسی نے "المواق"، "تاج" اور "اکلیل" کے عنوان سے کتب تحریر کیں۔

8.3-فقہ شافعی کی بنیادی کتب

فقہ شافعی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے مذہب کی بنیادی کتب خود اس کے بانی امام شافعی کی تصنیف کردہ ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

1. رسالۃ فی ادلۃ الاحکام
2. کتاب الام
3. کتاب مااختلف فیہ ابو حنیفۃ و ابن ابی لیلی
4. کتاب خلاف علیؓ و ابن مسعودؓ
5. کتاب ماخالف فیہ العراقیوں علیا و عبداللہ
6. اختلاف مالک و الشافعی
7. کتاب جماع العلم
8. کتاب ابطال الاستحسان
9. کتاب شید الاوزاعی
10. اختلاف حدیث
11. کتاب المسند
12. کتاب فی الفقہ

تیسری صدی ہجری میں امام ابو ابراہیم اسماعیل بن یحیی المزنی نے "الجامع الکبیر"، "الجامع الصغیر"، "مختصر"، (جو مختصر المزنی کے نام سے مشہور ہے) "المنثور" ،"المسائل المعتبرہ"،"الترغیب فی العلم" اور "کتاب الوثائق" تحریر کیں۔

چوتھی صدی ہجری میں ابن زیاد نیشاپوری نے کتاب "الربا" اور محمد بن احمد الحداد نے "الفروع المتکبرۃ الغریبۃ" اور "ادب القاضی و الفرائض" تصنیف کیں۔

پانچویں صدی ہجری میں قاضی ابوالحسن علی بن محمد الماوردی نے "الحاوی" ،"ادب الدنیا والدین" اور "الاحکام السلطانیہ" کے نام سے کتب تحریر کیں۔

چھٹی صدی ہجری میں امام غزالی نے کتاب "الوجیز" تحریر کی۔

ساتویں صدی ہجری میں امام محی الدین یحیی بن شرف نووی نے "الروضہ"، "المنہاج" اور "الاذکار والا رشاد" تصنیف کیں۔

آٹھویں صدی ہجری میں جمال الدین الاسنوی نے "المحتاج فی شرح المنهاج" اور نویں صدی ہجری میں تقی الدین ابو بکر محمد الحسینی نے "شرح التنبیه" ، " شریح المنهاج "اور "الغاویه والنهایه" تحریر کیں۔

8.4-فقہ حنبلی کی بنیادی کتب

امام احمد بن حنبل کی فقہ پر تیسری صدی ہجری میں ابو بکر الاثرم احمد بن احمد نے کتاب "السنن فی الفقه علی مذهب احمد" اور چوتھی صدی ہجری میں ابوالقاسم عمر بن الحسین الخرقی نے "المختصر فی الفقه" تحریر کیں۔

پانچویں صدی ہجری میں ابو علی الھاشمی محمد بن احمد نے "الارشاد" اور ابو جعفر بن ابی موسی عبدالخالق بن عیسٰی نے "روؤس المسائل" اور" شرح المذهب" تصنیف کیں۔

چھٹی صدی ہجری میں ابوالفواء علی بن عقلیل الطفری نے "کتاب الفنون" اور قاضی ابوالحسین بن الفراء البغدادی نے" المجوع فی الفروع" کے عنوان سے کتب تحریر کیں۔

ساتویں صدی ہجری میں امام ابو محمد عبداللہ بن احمد ابن قدامہ نے "المغنی" مدد الدین عبدالسلام بن عبداللہ بن تیمیہ نے "المنتقی"، "المحر" اور "منتہی الغایة شریح الهدایه" تصنیف کیں۔

خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 1: صحابۂ کرام کے درمیان فقہی اختلاف کے اسباب کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر 2: ان فقہی مذاہب پر روشنی ڈالیے جواب ختم ہو چکے ہیں۔

سوال نمبر 3: تیسری صدی ہجری میں مذاہب اربعہ پر کون کون سی کتابیں تصنیف کی گئیں؟ان کتب کی خصوصیات کی وضاحت بھی کیجیے۔

یونٹ نمبر5

علم الکلام

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 91

یونٹ کے مقاصد 91

1- مختصر تاریخ 92

2- علم کلام کی نشو و نما اور ارتقاء کے اسباب 95

3- اصول دین میں اختلاف کے اسباب 95

3.1- پہلا اختلاف 96

3.2- دوسرا اختلاف 96

3.3- تیسرا اختلاف 97

3.4- چوتھا اختلاف 97

4- علم کلام کے اہم مسالک 99

4.1- اشاعرہ 99

4.2- ماتریدیہ 101

4.3- متکلمین کی تالیفات 102

یونٹ کا تعارف

اسلام عقائد، عبادات اور اخلاق سے عبارت ہے۔ اس کے بنیادی اصول واضح، دلکش اور ہر شخص کے لئے یکساں قابل قبول ہیں۔ جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تھا، ان کے اقوال اور ان کے باتیں سنی تھیں اور وہ ان پر کاربند ہونا عین ایمان خیال کرتے تھے، کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں کسی تذبذب کا شکار ہو جائیں۔ جب تک وہ اور ان کے ماننے والے دنیا میں موجود رہے، کوئی فلسفہ مسلمانوں کی ایمانی اور مذہبی پختگی کو ٹھیس نہ پہنچا سکا البتہ بعد کے ادوار خصوصاً دورِ عباسیہ میں جب یونان اور فارس کے علمی ذخیرے عربی زبان میں آئے اور تمام قوموں کو مذہبی مباحثات و مناظرات میں عام آزادی دی گئی تو اسلام کو ایک بڑے خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔ دیگر مذاہب کے پیروکار ہر طرف سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور فتوحات اسلام سے ان کو جو صدمہ تلوار سے پہنچ چکا تھا اس کا انتقام وہ قلم سے لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے عقائد و مسائل اسلام پر اس آزادی اور بے باکی سے نکتہ چینیاں کیں کہ ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے اعتقاد متزلزل ہونے لگے۔

اس وقت اگرچہ نہایت آسانی سے ممکن تھا کہ حکومت کے زور سے نکتہ چینیوں کی زبانیں بند کر دی جاتیں لیکن مسلمانوں کی آزاد خیالی نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ قلم کا جواب تلوار سے دیا جائے۔ علمائے اسلام نے نہایت شوق اور محنت سے فلسفہ سیکھا اور جو ہتھیار مخالفین نے اسلام کے مقابلہ میں استعمال کئے تھے، انہی سے ان کے وار روکے۔ ان علمی معرکوں میں علمائے اسلام نے جو علمی کارنامے انجام دیئے وہ آج علم کلام کے نام سے مشہور ہیں۔

یونٹ کے مقاصد

ہمیں امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. علم الکلام کی تاریخ اور اس کے ارتقاء پر بحث کر سکیں۔
2. علم کلام میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان مختلف فیہ مسائل کی وضاحت کر سکیں۔
3. جائزہ لے سکیں کہ علم کلام پر کون کون سی بنیادی کتب تحریر کی گئیں اور ان کی کیا خصوصیات ہیں ؟

1- مختصر تاریخ

علم کلام وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان کو یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ استدلال و براہین قائم کر کے اور شکوک و شبہات کا ازالہ کر کے دینی حقائق کا اثبات کرے۔ اس علم کا موضوع اللہ تعالی کی ذات وصفات ہے۔

اس علم کی تاریخ کے بارے میں علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

"شارع" نے ہمیں ایسے خالق واحد پر ایمان لانے کا تو حکم دیا جس کی جانب تمام افعال لوٹتے ہیں اور ساتھ ہی ہم کو یہ بتایا کہ اسی ایمان پر ہماری نجات کا دارومدار ہے۔ لیکن ہمیں اس خالق و معبود کی کنہ و حقیقت کی معرفت نہیں بخشی، اس لئے کہ اس کی ذات ہمارے عقلی ادراک اور ہمارے مادی علم ذرائع کی حقیقت کی رسائی سے بلند و ماوراء ہے، اس لئے ہمیں اولاً یہ اعتقاد رکھنے کا پابند کیا گیا کہ اس کی ذات کسی بھی مخلوق کی مشابہت و مثلیت سے پاک و منزہ ہے ورنہ اس ذات کا ان مخلوقات کے لئے خالق ہونا صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ اگر خالق بھی کسی مخلوق کی طرح کا ہو، تو پھر آخر دونوں میں فرق و امتیاز کیا رہے گا۔ پھر ہمارے لئے یہ اعتقاد ضروری قرار پایا کہ اس کی ذات نقص و عیب کی ہر صفت سے منزہ ہے، ورنہ مخلوق سے مشابہت لازم آئے گی، پھر اس حقیقت کا اعتقاد ضروری ہوا کہ وہ تنہا اس کائنات کا خالق و موجد ہے اور خلق و ایجاد میں کوئی اس کا شریک نہیں، ورنہ ایک سے زائد خالق و موجود ہونے کی صورت میں فیصلوں کا ٹکراؤ ضروری ہے اور ٹکراؤ کی صورت میں خلق و ایجاد کی کارفرمائی ممکن نہ تھی اور پھر یہ اعتقاد رکھنا بھی ضروری ٹھہرا کہ وہ خالق، عالم بھی ہے اور قادر بھی ہے اور اسی لئے خلق و ایجاد کے کمال کی ان ساری کارفرمائیوں میں ایک منصوبے اور نظم کی شہادت ملتی ہے نیز یہ اعتقاد لازم ہے کہ وہ خالق صاحب ارادہ بھی ہے، ورنہ مخلوقات میں تشخصات و تعینات کی جلوہ سامانیاں نہ ہوں اور یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ اس کی مشیت اور اس کا ارادہ بے تقدیر نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز عدم سے وجود میں آئی ہے اس کا اس نے پہلے ہی سے ارادہ کیا تھا، جو اپنے وقت پر ٹھیک ٹھیک اس کے اندازے اور پیمانے کے مطابق وجود میں آئی ورنہ اس کا ارادہ مخلوق کی طرح کا ایک حادث ارادہ ہو گا قدیم نہ ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ وہ ہماری موت کے بعد پھر ہمیں زندہ کر کے اٹھائے گا تاکہ خلق و ایجاد کی غرض و غایت پوری ہو اور نظام کائنات کے ارتقاء کی تکمیل ہو، ورنہ یہ سارا کارخانہ بچوں کے گھروندے کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کے لئے ہو تو نہایت حکیمانہ تدبیر سے اس نظام کائنات کا چلانا، اور خلق و ایجاد کی یہ ساری کارفرمائیاں، سب کچھ فعل عبث ہوگا لہذا موت کے بعد سرمدی اور دائمی بقاء کے لئے ضروری ہے کہ بعث بعد الموت ہو۔

اسی طرح ایمان بالرسل کا معاملہ ہے کہ ہمارے لئے یہ اعتقاد لازم ٹھہرا کہ اللہ تعالی نے انبیاء اس لئے مبعوث فرماتے تاکہ وہ ہمیں اخروی زندگی کی محرومیوں سے نجات کی راہ دکھائیں، اس لیے کہ آخرت کی زندگی میں سعادتیں بھی ہیں اور شقاوتیں بھی اور ہم از خود محض اپنی عقل سے نہیں جان سکتے کہ کس طرح کے عمل سے سعادت حاصل ہو گی اور کیسے عمل کے سبب شقاوت سے سابق پڑے گا لہذا اللہ تعالی نے اپنے فضل و کرم سے اپنے رسولوں کے توسط سے ہمارے سامنے دونوں راہیں واضح کر دیں اور بتادیا کہ کون سی راہ عمل اس جنت تک پہنچاتی ہے جو نعمتوں سے بھرپور ہے اور کون سا راستہ اس جہنم کو جاتا ہے جو عذاب کے لیے بنائی گئی ہے۔

غرض، یہ وہ بنیادی عقائد ایمانیہ ہیں جو عقلی دلائل سے مشید ہیں اور ان سے متعلق کتاب و سنت میں بکثرت دلائل موجود ہیں اور اسلاف کرام نے ان دلائل کو پیش نظر رکھا علمائے متقدمین نے ان سے کام لئے اور آئمہ نے ان سے لوگوں کی رہنمائی کی لیکن پھر آگے چل کر ان عقائد کی تفصیلات میں اختلاف واقع ہو گیا اور ان اختلافات کا سبب زیادہ تر آیات متشابہات ہیں، چنانچہ پھر یہ اختلافات لوگوں کو مباحثہ اور مناظرہ کے میدان میں کھینچ لایا اور منقولات سے آگے بڑھ کر عقلی استدلالات کی زور آزمائیاں ہونے لگیں، بس یہیں سے اس علم کلام کی بنیاد پڑتی ہے۔

مذہبی معتقدات کی تعبیر میں عقل و منطق کے استعمال پر اعتراضات شروع سے ہی کئے جاتے رہے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں جب ابو الحسن الاشعری نے معتزلہ کے فلسفیانہ اور عقلی مباحث کا جواب خود انہی کے انداز و اسلوب میں دینا چاہتا تو انہیں اس بناء پر ہدف تنقید بنایا گیا۔ روایت پسند حلقوں نے دینیاتی مسائل اور کلام کا خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ جب ان کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا تو انہیں موضوع بحث کیوں بنایا جائے۔ اگر یہ لوگوں کی رہنمائی کے لیے ضروری ہوتے ہیں تو حضور ﷺ ان پر ضرور روشنی ڈالتے۔ آپ ﷺ نے ان پر اظہار خیال نہیں فرمایا تو اتباع سنت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیں ان کے بارے میں گفتگو کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ دینی معاملات میں عقل و فکر کو استعمال کرنا ضلالت و گمراہی اور بدعت پر منتج ہو سکتا ہے۔ اشعری نے اس کے جواب میں اپنی کتاب "رساله فی استحسان الحوض فی اعلم الکلام" میں تین طرح کی بحثیں کی ہیں:

1. روایت پسندوں کے اعتراض کو خود انہی کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ نے ان مختلف مسائل پر اظہار خیال نہیں فرمایا آپ نے ان پر گفتگو کرنے کو ممنوع بھی تو قرار نہیں دیا۔ اگر معترضین اسے ممنوع قرار دیتے ہیں تو دراصل وہ خود ایک بدعت کا ارتکاب کرتے ہیں۔

2. یہ ٹھیک ہے کہ کلام کے مسائل اپنی تمام جزئیات کے ساتھ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کبار کے عہد میں موجود نہ تھے لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس کے اساسی اصول خود قرآن اور احادیث میں موجود ہیں۔ اس موضوع پر اشعری نے کئی مثالیں پیش کیں ہیں۔

3. یہ مسائل آنحضرت ﷺ کے احاطہ علم میں موجود تھے لیکن آپ نے ان پر اس لئے اظہار خیال نہ فرمایا کہ یہ واقعتاً اس دور میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور ان پر بات کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی۔

علم کلام کو دو واضح اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1. وہ علم کلام جو خاص طور پر اسلامی فرقوں کے باہمی سیاسی یا اعتقادی نزاع کی بدولت پیدا ہوا۔

2. وہ علم کلام جو فلسفے کے مقابلے کے لیے ایجاد ہوا۔

متقدمین کے ہاں یہی دو اقسام معروف ہیں لیکن امام غزالیؒ نے فلسفہ و کلام میں اختلاط و اشتراط کی بنیاد ڈالی، امام رازی نے اسے ترقی دی اور پھر متاخرین نے اس قدر خلط مبحث کر دیا کہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں فلسفہ کلام اصول عقائد سب گڈ مڈ ہو کر ایک معجون مرکب بن گیا۔ (علم الکلام: 20)

اس سلسلے میں ابن خلدون کا بیان ہے کہ

> "شروع شروع میں اسے فلسفیانہ رنگ نہیں دیا گیا کیونکہ ایک تو فلسفے کا لوگوں میں بہت کم رواج ہوا تھا اور جتنا رواج پذیر ہوا تھا اس سے بھی متکلمین اس لئے گریزاں رہتے تھے کہ وہ اسے عقائد شریعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ پھر منطقی استدلال سے کام لیا جانے لگا اور نئے نئے دلائل پیش کئے جانے لگے۔ یہی جدید طریقہ تھا جو متاخرین کا طریقہ کہلایا اور جس میں نئے قواعد اور دلائل لائے گئے۔ اگرچہ اس میں بھی جگہ جگہ فلاسفہ کے خیالات کی تردید کی تھی اہتمام متاخرین نے علم کلام کو اس رنگ میں ڈھال دیا کہ کلام و فلسفہ میں تمیز کرنی مشکل ہو گئی اور وہ باہم مل جل کر گویا ایک ہی چیز نظر آنے لگے۔" [24]

---

[24] مقدمہ ابن خلدون ص: 466

2- علم کلام کی نشو و نما اور ارتقاء کے اسباب

احمد امین "ضحیٰ الاسلام" میں لکھتے ہیں کہ علم کلام کی نشو و نما اور ارتقاء کے اسباب میں سب کچھ داخلی تھے اور کچھ خارجی، داخلی اسباب وہ تھے جو خود اسلام اور مسلمانوں کی طبیعت کا تقاضا تھے، مثلاً

1. قرآن حکیم کا یہ اسلوب کہ اس نے نہ صرف یہ کہ توحید و نبوت کی دعوت دی بلکہ اہم ادیان عالم اور اقوام کے عقائد و نظریات سے بحث بھی کی اور ان کے اغلاط کا رد کیا۔
2. فتوحات سے فراغت کے بعد مسلمان دینی بحث و مباحثہ کی طرف متوجہ ہونے لگے فلسفے کی طرف بھی میلان ہوا اور دینی اختلاف ظہور میں آیا۔
3. خارجی اسباب اجنبی ثقافتوں اور غیر اسلامی عقائد و نظریات کی بدولت پیدا ہوئے۔ ان میں سے اہم سبب یہ تھا کہ مختلف ادیان کے ماننے والوں کا رد فلسفیانہ نقطہ نظر سے دلائل کے ساتھ کیا جائے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اسلام جب تک عرب کی محدود فضا میں رہا، عقائد کے بارے میں کوئی زیادہ باریک قسم کی کدو کاوش، چھان بین اور بحث و نزاع پیدا نہ ہوئی، جس کا سبب یہ تھا کہ عربوں کا مذاق تخیلی نہیں بلکہ عملی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عملی طور (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) کے بارے میں تو ابتداء ہی سے مسائل کی تحقیق کا آغاز ہو چکا تھا حتی کہ خود صحابۂ کرام کے زمانے ہی میں فقہ و تفسیر کے مجموعے تیار ہونے لگے تھے لیکن جو باتیں ایمان و اعتقاد سے تعلق رکھتی تھیں ان کے بارے میں زیادہ بحث و نزاع اور نکتہ چینی نہیں ہوئی بلکہ اجمالی طور پر ہی عقیدے کا ماننا کافی سمجھا گیا۔ موشگافیاں بعد میں مختلف اسباب سے ہوئیں۔

3-اصول دین میں اختلاف کے اسباب

علامہ شہرستانی نے اختلاف کے مختلف اسباب سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اختلاف کے اصول اسلامی فرقوں کے مابین یہ چار امور تھے:

1. صفات الٰہی کا اثبات

2. جبر وقدر کی حقیقت
3. عقائد واعمال کی حیثیت
4. عقل و نقل کا نزاع

3.1-پہلا اختلاف

پہلا اختلاف اس طرح پیدا ہوا کہ خدا کے متعلق قرآن مجید میں جو الفاظ اس قسم کے مذکور ہیں جو جسمانیات کے لئے مخصوص ہیں مثلاً عرش پر متمکن ہونا۔ قیامت کے دن فرشتوں کے جھرمٹ میں آنا وغیرہ، ان کے حقیقی معنی لئے جائیں یا مجازی، اس سوال نے دو مختلف فرقے پیدا کر دیئے۔ پہلی شق کے ماننے والے محدثین اور اشعریہ ہیں جن میں سے بڑھتے بڑھتے مجسمہ اور مشتبہہ نکل آئے جو خدا کے ہاتھ پاؤں تک مانتے ہیں۔ دوسرے احتمال کے قائل معتزلہ ہیں جن کا دوسرا نام منکرین صفات ہے۔

اسی مسئلہ کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ خدا کی صفات کو اگر قدیم مانیں تو تعدد قدما لازم آتا ہے اور حادثات کہیں تو خدا کا محل حوادث ہونا خدا کے حدوث کا مستلزم ہے پہلی مشکل سے بچنے کے لیے معتزلہ نے یہ رائے اختیار کی کہ خدا کے علیحدہ صفات نہیں ہیں بلکہ اس کی ذات ہی سے وہ تمام نتائج حاصل ہوتے ہیں جو ہم کو صفات سے ہوتے ہیں۔ محدثین سمجھے کہ یہ خدا کی صفات کا انکار ہے اس بنا پر انہوں نے خدا کے جداگانہ صفات قرار دیے۔

3.2-دوسرا اختلاف

دوسرے اختلاف کا منشاء یہ تھا کہ انسان کے افعال کو اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز بھی ہمارے بس میں نہیں۔ یہاں تک کہ ہمارا ارادہ اور خواہش بھی اختیار میں نہیں لیکن شکل یہ ہے کہ اگر ہم اپنے افعال میں مجبور ہیں تو ثواب و عقاب جو مذہب کی جانب ہے اس کی بنیاد اکھڑ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں دونوں قسم کی آیتیں ہیں بعض میں صاف تشریح ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کراتا ہے۔"قل کل من عنداللہ"۔ جب کہ بعض کا یہ

مطلب ہے کہ انسان اپنے افعال کا آپ ذمہ دار ہے۔"ما اصابک من سیئة فمن نفسک"اس بناپر اسلام میں دو رائیں قائم ہو گئیں۔ جو لوگ زیادہ آزاد خیال تھے انہوں نے صاف جبر کو مانا اور جبریہ کہلائے جو اس لفظ سے جھجکتے تھے انہوں نے کسب اور ارادہ کا پردہ رکھا۔ یہ پردہ بھی ابوالحسن اشعری نے ایجاد کیا ورنہ قدما اس کا نام بھی نہیں لیتے، برخلاف اس کے معتزلہ نے یہ رائے قائم کی کہ انسان اپنے تمام افعال میں مختار محض ہے۔ البتہ یہ اختیار اس کو خدا نے دیا ہے اور اس لئے خدا کے اختیار مطلق میں فرق نہیں آتا۔

3.3۔ تیسرا اختلاف

تیسرا اختلاف اس بناپر تھا کہ ایمان کی حقیقت میں اعمال بھی داخل ہیں یا نہیں؟ چونکہ اکثر حدیثوں میں حیاء وغیرہ کی نسبت یہ الفاظ ہیں کہ "انه من الایمان "اس لئے محدثین نے سمجھا کہ ایمان کی حقیقت میں اعمال میں داخل ہیں لیکن اہل نظر نے جن میں امام ابو حنیفہ سب سے پیش رو تھے۔ اس سے اختلاف کیا اور اعتقاد و عمل میں تفریق کی۔ محدثین نے ان لوگوں کا نام مرجیہ رکھا چنانچہ امام ابو حنیفہ کو بھی بہت سے محدثین مرجیہ ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

3.4-چوتھا اختلاف

چوتھا اختلاف در حقیقت ایسا اختلاف ہے جو حقیقی اختلاف کہا جاسکتا ہے اور جہاں ارباب ظاہر اور اہل نظر کی حدیں بالکل الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اس اختلاف کا منبع یہ ہے کہ قول و نقل میں کسی کو ترجیح ہے؟ یا یہ کہ عقل و نقل کی کیا حدود ہیں، تمام اشاعرہ نقل کو ترجیح دیتے ہیں اور معتزلہ وغیرہ عقل کو۔

اس اصول کی بنیاد پر جو تفصیلی عقائد قائم ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں۔

اشعریہ	معتزلہ
1. کوئی شے فی نفسہٖ اچھی یا بری نہیں۔ شارع جس چیز کو اچھی کہہ دیتا ہے اچھی ہو جاتی ہے اور جس کو	1. ہر شے پہلے سے اچھی یا بری ہے۔ شارع اسی چیز کو اچھی کہتا ہے جو فی نفسہٖ اچھی تھی اور اسی چیز کو بری

بری کہتا ہے بری ہو جاتی ہے۔	کہتا ہے جو پہلے سے بری تھی۔
2. خدا محالات کا حکم دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔	2. خدا کسی محال چیز کا حکم نہیں دے سکتا۔
3. خدا کو عدل اور انصاف کرنا ضروری نہیں۔	3. ضروری ہے۔
4. خدا عبادت کے عوض میں عذاب دے سکتا ہے اور گناہ کے بدلے میں انعام اور اگر وہ ایسا کرے تو ناانصافی نہیں۔	4. خدا کبھی ایسا نہیں کر سکتا اور ایسا کرے تو یہ ظلم اور ناانصافی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ متکلمین سب کے سب عقل کی فوقیت کے قائل تھے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ ان میں سے بعض ضرور ایسے تھے مثلاً معتزلہ کے بعض گروہ لیکن فی الجملہ علمائے کلام قرآن سنت کو اول حیثیت دے کر قائد کا اثبات عقلی دلیلوں سے کرتے تھے۔

کلام کے یہ مسئلے کچھ تو سیاسی نزاعات سے پیدا ہوئے اور کچھ قرآن مجید کی آیات (خصوصاً آیات مشتبہات) سے اور کچھ یونانی معقولات کی بنا پر۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو یہ بحثیں فروعی اور غیر اہم معلوم ہوتی تھیں لیکن درحقیقت ان میں سے بیشتر کی زد بالآخر اصول دین پر پڑتی ہے اس لئے محدثین، فقہاء اور بعض میں اشاعرہ کو ان کی طرف ملتفت ہونا پڑا ورنہ اس بات کا خدشہ تھا کہ اصولی عقائد دین، ذات باری، نبوت و رسالت، قرآن مجید کا کلام اللہ ہونے اور اعمال و جزاء کی بنیادی اہمیت جیسے مسائل میں دین کا شیرازہ بگڑ جاتا اور اس کے زیر اثر باقی معاشرتی و اخلاقی قوانین اور نظم عبادت و معتقدات میں بھی خلل آتا۔ اس کے علاوہ ان بحثوں کے اندر سے بہت سے موضوعات ایسے بھی نکل آئے جن کا اسلامی فکریات میں شمار ہوا، مثلاً اشاعرہ کا مسئلہ جواہر جس کی اہمیت بیسویں صدی عیسوی میں نمایاں ہوئی۔ آغاز میں تو یہ محض سادہ سے سال تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کے اندر سے فروعات کا ظہور ہوا جس کے باعث منظم مسلک قائم ہوتے چلے گئے پھر ہر مسلک کی مزید چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی چلی گئیں۔

4- علم کلام کے اہم مسالک

ذیل میں علم کلام کے دو زیادہ مشہور مسالک یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ کا تعارف کرایا جارہا ہے۔

4.1-اشاعرہ

یہ مکتب فکر جسے اشعریہ کے نام سے بھی یاد کیا جاہے۔ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری کی طرف منسوب ہے اور چوتھی صدی ہجری سے لے کر اب تک علم الکلام کا سب سے بڑا اور مشہور ترین کتب چلا آرہا ہے۔

اس مکتب فکر کے بانی امام اشعری بہت بڑے مصنف تھے۔ بعض روایات کے مطابق ان کی تصانیف کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ آپ کے افکار کی شوافع میں قدر و منزلت ہوئی۔ احناف میں بھی ان کے پیروکار پائے جاتے ہیں۔

شوافع میں سے مشہور ترین اشعری علماء کے نام یہ ہیں: ابو سہل، الصعلوکی، ابو بکر قفال، ابو زید مروزی، زاہر بن احمد، حافظ ابو بکر جرجانی، شیخ ابو محمد طبری، ابو عبید اللہ طائی، الحسن باہلی، بندار بن حسن صوفی، یہ لوگ اگرچہ خود بھی مشہور تھے لیکن ان کے شاگرد مثلاً ابو بکر باقلانی، ابو اسحاق سفرائنی، ابو بکر بن فورک اور پھر ان کے شاگرد امام الحرمین وغیرہ ان سے بھی زیادہ نامور ہوئے۔ اگرچہ ابتداء میں امام غزالی نے بھی اشعری مکتب فکر کی حمایت کی لیکن بعد میں وہ کسی خاص مکتب کے مقلد نہ رہے بلکہ اشاعرہ کے طریق سے الگ عقائد وافکار کی تشریح کی تاہم ان کے اور اشاعرہ کے مسلک میں کچھ زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔

علم کلام کی تاریخ میں ہمیں ایک طرفہ معتزلہ کا گرہ نظر آتا ہے اور دوسری طرف حشوریہ و مجسمہ و مشبہہ کا۔ معتزلہ صفات باری تعالی کی نفی کرتے اور حشویہ و مجسمہ صفات باری کو صفات مخلوق کے مماثل قرار دیتے تھے۔ امام اشعری کا مسلک ان دونوں انتہائوں کے بین بین واقع ہے۔ انہوں نے صفات باری کے عقیدے کو تسلیم کیا اور کہا کہ وہ صفات حوادث کے مماثل نہیں بلکہ ذات خداوندی کے لائق ہیں جیسا کہ اس کی شان کا تقاضا ہے۔ امام اشعری نے محدثین و فقہاء اور معتزلہ کے اختلاف مسائل میں اول الذکر حضرات کا ساتھ دیا اور اہل بدعت سے گریزاں رہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشاعرہ نے مسئلہ صفات میں نفی واثبات میں مبالغہ اور غلو سے ہٹ کر ایک مسلک اعتدال کو اختیار کیا

اور افراط و تفریط سے دامن بچایا۔ انہوں نے عقائد میں عقل و نقل دونوں سے کام لیا تاہم عقل کو افکار و نظریات کی دنیا میں حاکم و منصف قرار نہیں دیا بلکہ اس سے نصوص شرعیہ کے لئے خادم کی حیثیت سے کام لیا۔ اشعری علم کلام کا ایک بڑا حصہ فلسفہ یونان کے رد پر بھی مشتمل ہے۔

اشاعرہ کے اعتقادات

امام غزالی نے "احیاء العلوم" میں اشعرہ کے جن اعتقادات کا ذکر کیا ہے ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

اللہ تعالی کی ذات کے بارے میں اشاعرہ کا یہ عقیدہ یہ ہے کہ خدا موجود ہے، واحد ہے، قدیم ہے، جوہر نہیں ہے، جسم نہیں ہے، عرض نہیں ہے، کسی جہت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، کسی مکان میں نہیں ہے، وہ نظر آ سکتا ہے، ہمیشہ رہے گا۔

اللہ کی صفات یہ ہیں کہ وہ زندہ ہے، عالم ہے، قادر ہے، صاحب ارادہ ہے، سنتا ہے، دیکھتا ہے، بولتا ہے، حوادث کا محل نہیں، اس کا کلام قدیم ہے۔

افعال الٰہی کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق خدا ہے، بندے اپنے افعال کے مکتسب ہیں، خدا نے ان افعال کا ہونا چاہا، خدا نے جو خلق و اختراع کیا یہ اس کا احسان ہے، خدا کو جائز ہے کہ "تکلیف مالایطاق" دے، خدا کو جائز ہے کہ وہ بے گناہ کو عذاب دے، خدا پر مصلحت کی پابندی نہیں، واجب وہی جز ہے جو شرع کی رو سے واجب ہے۔

سمعیات کے بارے میں ان کے اصول یہ ہیں: قیامت، منکر نکیر، قبر کا عذاب، میزان، پل صراط، بہشت و دوزخ کا وجود، احکام امامت، صحابہ کی فضیلت بہ ترتیب خلافت، امام کی شرائط، امام مشروط موجود نہ ہو تو سلطان وقت کے احکام۔

رؤیت باری تعالی کا معتزلہ نے انکار کیا اور قرآنی آیات کی تاویل کی جب کہ مشبہہ نے کہا کہ اللہ کو محدود و مکیف حالت میں دیکھا جا سکے گا۔ اشعری نے آخرت میں رویئت باری کا عقیدت تو تسلیم کیا لیکن اس بات کی نفی کی کہ اسے محدود و مکیف حالت میں دیکھا جائے گا۔

4.2-ماتریدیہ

اعتقادات کی دنیا کا دوسرا بڑا مدرسہ فکر ماتریدیہ کا ہے، جس کی نسبت امام ابو منصور محمد بن محمد بن محمود ماتریدی (متوفی 333ھ) کی طرف کی جاتی ہے۔ امام ماتریدی کے متبعین میں اکثریت احناف کی ہے۔ جب کہ امام اشعری کے متبعین کی اکثریت شوافع میں تھی اور غالباً اسی لئے احمد امین کی رائے ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان جو معمولی اختلاف پایا جاتا ہے وہ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے اصول کا نتیجہ ہے۔ (ظہر الاسلام)

ماتریدیہ کو اشاعرہ کے مقابیل میں کم شہرت ملنے کی وجہ شبلی نعمانی نے یہ بیان کی ہے کہ علمائے حنفیہ نے علم کلام میں بہت کم تصانیف لکھی ہیں۔ اس فن میں جس قدر مشہور اور معرکۃ الآراء کتابیں ہیں وہ شافعیہ کی تصنیفات ہیں جو عموماً اشعریہ تھے۔ (علم الکلام، ص: 75)

اس عدم شہرت کا یہاں تک اثر ہوا کہ آج اکثر حنفی علماء اشاعرہ ہی کے ہم عقیدہ ہیں حالانکہ قدیم زمانے میں کسی حنفی کا اشعری ہونا نہایت تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

امام اشعری اور امام ماتریدی کے مشترکہ مدمقابل معتزلہ تھے۔ لہذا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کئی مسائل میں دونوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے تاہم اکثر اساسی مسائل میں وہ ہم خیال یا متقارب تھے۔ دونوں کے مختلف فیہ مسائل کی تعداد چالیس کے قریب پائی جاتی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ماتریدی کے افکار کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا گہرا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ کے اعتقادی افکار و نظریات کو پیش نظر رکھا اور ان سے استفادہ کیا کیونکہ دونوں کے افکار میں ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔

امام ماتریدی نقل کے ساتھ ساتھ عقل پر بھی اعتماد کرتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نور شریعت سے منور ہو اور ان کے نزدیک فقط انہی احکام عقلیہ سے استناد جائز ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے بھی ان کا اصول یہی ہے کہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹایا جائے اور متشابہات کی تاویل و تشریح محکمات کی روشنی میں کی جائے۔

شبلی نعمانی نے مندرجہ ذیل نو مسائل کا ذکر کیا ہے، جن میں امام ماتریدی، امام شعری کے مخالف ہیں:

1. اشیاء کا حسن و قبح عقلی ہے۔

2. خدا کسی کو تکلیف مالایطاق (ایسی تکلیف جو برداشت سے باہر ہو) نہیں دیتا۔
3. خدا ظلم نہیں کرتا اور اس کا ظالم ہونا عقلاً محال ہے۔
4. خدا کے تمام احکام مصالح پر مبنی ہیں۔
5. آدمی کو اپنے افعال پر قدرت اور اختیار حاصل ہے اور یہ قدرت ان افعال کے وجود میں اثر رکھتی ہے۔
6. ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا۔
7. زندگی سے ناامیدی کی حالت میں بھی توبہ مقبول ہے۔
8. حواس خمسہ سے کسی چیز کا محسوس کرنا، علم نہیں بلکہ ذریعہ علم ہے۔
9. اعراض کا اعادہ نہیں ہو سکتا۔(علم الکلام اور الکلام، ص: 76)

4.3- متکلمین کی تالیفات

علم کلام پر جن متکلمین نے کتب تحریر کیں ہیں ان کا یہاں مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ابو الحسن اشعری(متوفی 330ھ) جنہیں اشاعرہ کا امام کہا جاتا ہے۔ اپنے "مقامات الاسلامیین" اور "کتاب الابانة عن اصول الدیانه" لکھیں۔

ماتریدیہ کے امام محمد بن محمد بن محمود ماتریدی(متوفی 333ھ) نے "کتاب التوحید"، "کتاب المقالات"،"بیان و هم المعتزله"اور"تالیفات القرآن" کے نام سے کتب تحریر کیں۔

ابن حزم(متوفی 546ھ) کی "الفصل فی الملل والا هواءوالنحل"اس فن پر مشہور کتاب ہے۔ابو الحسن محمد بن علی البصری نے"تصفح الادلة"اور"غرور الادلة" کے نام سے کتب لکھیں۔

امام غزالی نے علم کلام پر کئی کتب تحریر کیں۔ جن میں مشہور حسب ذیل ہیں:

1. تهافة الفلاسفه
2. التفرقه بین الاسلام و الزندقه
3. مشکواة الانوار

4. القسطاس المستقيم
5. الاقتصادفی الاعتقاد
6. جواهر القرآن
7. الجام العوام،
8. منقذمن الضلال

شہرستانی نے اس فن پر" نهاية الاقدام فی علم الكلام "، "المنهاج والبيان "اور "الملل و النحل "تصنیف کیں۔

علامہ فخر الدین رازی (متوفی: 606ھ) نے اس فن پر جو کتب تصنیف کی وہ یہ ہیں:

1. مطالب عاليه
2. نهاية العقول
3. اربعين فی اصول الدين
4. مباحث مشرقيه
5. البيان و البرهان
6. تہذيب الدلائل
7. تحصيل الحق
8. كتاب القضاء و القدر
9. كتاب الخاق والبعث

شیخ شہاب الدین مقتول (متوفی: 586ھ) نے "هياكل النور"اور "حكمة الاشراق" کے عنوان سے کتب تحریر کیں۔

علامہ تفتازانی نے "شرح مقاصد"اور قاضی عضدوسید شریف نے "شريح مواقف"اور "صحائف"تحریر کیں۔

سیف الدین آمدی (متوفی 631ھ) نے اس فن پر "وقایق الحقایق" اور "رموز الکنوز" تصنیف کیں۔

ابن تیمیہ (متوفی، 728ھ) نے علم کلام پر "الاعتراضات المصریه"، "ردنصاریٰ"، "اثبات المعاد"، "الردعلی المنطق" اور "الکلام علی المحصل" تحریر کیں۔

شاہ ولی اللہ (متوفی 1176ھ) کی کتاب "حجة الله البالغة" میں بھی اس فن پر کئی مباحث ملتے ہیں۔

خود آزمائی

سوال نمبر 1: علم کلام کے حصول کا مقصد بیان کرتے ہوئے بتایئے کہ علم کلام اور فلسفہ کے مباحث کا اختلاط کیسے ہوا؟

سوال نمبر 2: علم کلام کے جواز وعدم جواز کے بارے میں اختلاف تحریر کرتے ہوئے آپ اپنی رائے مع دلائل بیان کیجیے۔

سوال نمبر 3: اشاعرہ اور ماتریدیہ کے درمیان مختلف فیہ مسائل کون کون سے ہیں؟

یونٹ نمبر 6

تصوّف

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 107
یونٹ کے مقاصد 107
1-تعریف 108
2-لفظ تصوّف کی اصل 108
3-تصوّف کا ارتقاء 109
4-تصوّف کا مقصد اور اس کی تدوین وتالیف 110
5-خود آزمائی 112

یونٹ کا تعارف

اسلام انسان کی ذہنی و عقلی اور جسمانی و روحانی ضرورتوں کا کفیل ہونے کے ساتھ ساتھ ہر شعبہ حیات میں ترقیات کا ضامن بھی ہے۔ ابتداء ہی سے مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا موجود تھا جس نے محض اللہ کی خوشنودی، اس کی یاد اور ذکر الٰہی کو زندگی کا مرکزی نقطہ اور مَطْمَح نَظَر قرار دیا تھا۔ ابتداء میں یہ گروہ مختلف ناموں سے معروف رہا لیکن بعد میں اس کا نام اہل تصوف ہو گیا۔ تصوّف دراصل اسلام کی خالص اور پاکیزہ ترین تعبیر تھی اور ان بزرگان دین کے نزدیک تصوّف کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اتباع کتاب و سنت میں انتہائی کوشش کی جائے، عبادات کو مقصد حیات سمجھا جائے اور نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کرتے ہوئے مجاہدات کے ذریعے تزکیہ باطن کیا جائے۔

اس یونٹ میں آپ تصوّف کی حقیقت، اس کی اصطلاحات اور اس کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. تصوّف کی وجہ تسمیہ بیان کر سکیں۔
2. تصوّف کے آغاز اور ارتقاء کا جائزہ لے سکیں۔
3. صوفیاء کے ہاں استعمال ہونے اصطلاحات کا تعارف کرا سکیں۔
4. تصوّف کے موضوع پر لکھی جانے والی اہم ابتدائی تالیفات پر تبصرہ کر سکیں۔

1-تعریف

قاضی ذکریاانصاری نے رسالہ قشیریہ کی شرح میں تصوّف کی تعریف اس طرح کی ہے:

"تصوّف وہ علم ہے جس سے تزکیہ نفس اور اخلاق کی پاکیزگی اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال کی معرفت حاصل ہوتی ہے تاکہ ابدی سعادت کا حصول ہو۔"

2-لفظ تصوّف کی اصل

لفظ تصوّف یاصوفی کی اصل کے بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف آراء دی ہیں۔ مثلاً:

1. تصوّف یاصوفی "صوف" (اون) سے ماخوذ ہے۔ چونکہ وصوفیاء عام لوگوں کے برعکس بیش قیمت لباس سے احتزاز کرتے اور اون کا لباس زیب تن کیا کرتے تھے اس لئے ان کو یہ لقب ملا۔
2. تصوّف "صفاء" (صفائی و پاکیزگی) سے نکلا ہے چونکہ صوفیاء مرید کے دل کو باطنی امراض سے دور کرتے ہیں اور خود ان کے دل بھی روحانی بیماریوں سے پاک ہوتے ہیں اس لئے وہ اس نام سے موسوم ہیں۔
3. تصوّف "صفہ" سے نکلا ہے۔ فقراء صحابہ کی ایک جماعت کو (جو مسجد نبوی میں حضور ﷺ کے زیر تربیت تھے)، اہل صفہ کہا جاتا ہے چونکہ صوفیاء بھی اہل صفہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اس لئے وہ اس نام سے مشہور ہوئے۔
4. اہل لغت کی ایک جماعت کے نزدیک تصوّف کا لفظ مشتق نہیں بلکہ جامد ہے۔ قشیری فرماتے ہیں کہ لفظ تصوّف کے مشتق ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ قیاس سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ لقب اور کسی سے مشتق نہیں جو لوگ اس کو صوف یا صفاء سے ماخوذ قرار دیتے ہیں، لغوی اعتبار سے ان کی بات بعید از قیاس ہے۔

3-تصوّف کا ارتقاء

تصوّف اپنی عمومی روح کے اعتبار سے آغاز اسلام سے موجود ہے۔ صحابۂ کرامؓ کی ایک کثیر تعداد دنیوی مال و متاع سے نفور اور زہد و تقشف کی دلدادہ تھی۔ وہ راتوں کو قیام کرتے اور دن کو روزہ رکھتے تھے لیکن وہ صحابی رسول کے علاوہ کسی اور نام سے موسوم نہیں ہوئے کیونکہ صحابیت سے بڑھ کر کوئی فضیلت نہ تھی ۔دور ثانی میں جن لوگوں نے صحابۂ کرام کو پایا ان کو تابعین کہا جانے لگا اور ان کی رائے میں سب سے زیادہ عزت و شرف اسی نام سے مشہور ہونے میں تھی۔ بعد میں لوگوں کا تعارف مختلف طریقوں سے ہونے لگا اور ان کے مراتب جدا جدا ہو گئے تو ان خاص لوگوں کو جنہیں امور دین سے بہت زیادہ شغف اور لگاؤ تھا ''زہاد'' اور ''عباد'' کہا جانے لگا۔

دوسری صدی ہجری میں اور اس کے بعد صوفیانہ نظریات پیدا ہوئے اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ پھیلتے چلے گئے پھر معاشرہ اور ماحول کے زیر اثر یہ نظریات تغیر پذیر رہے۔ فلاسفہ، متکلمین اور فقہاء نے بھی صوفیانہ افکار پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔ صوفیہ نے فلسفہ کے مقابلتاً زیادہ اثر قبول کیا بلکہ ایک جداگانہ فلسفہ اختیار کیا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ صوفیاء میں بعض ایسے لوگ ملتے ہیں جو فلاسفہ سے بہت قریب ہیں اور ایسی باتوں کا اعتماد کرتے ہیں جو دین کے اصول و عقائد سے متصادم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہور اہل سنت فلسفیانہ تصوّف کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور اس تصوّف کی تائید کرنے لگے جو زہد و تقویٰ اور نفس کی تربیت و اصلاح کے لئے مفید ہے۔ اہل سنت اور فلسفیانہ تصوّف کے درمیان یہ آویزش جاری رہی یہاں تک کہ اہل سنت نے ساتویں صدی ہجری کے اختتام پر ایسے تصوّف کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک حادثہ یہ ہوا کہ تصوّف میں ایسے لوگ بھی آدھمکے جو اس کے اہل نہ تھے۔ ان لوگوں نے زہد و تقویٰ کا لبادہ اوڑھ لیا اور جاہل محض ہونے کے باوجود لوگوں کی اصلاح و تربیت کا بیڑہ اٹھایا۔

4۔ تصوّف کا مقصد اور اس کی تدوین وتالیف

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ

"وہ عبادت گزار لوگ جو اس درجہ تک یعنی تمام اعمال میں نفس کا محاسبہ اور حقائق اعمال پر نظر تک نہیں پہنچے ہیں، وہ اپنی عبادتوں اور اطاعتوں کو خالص فقہی نگاہ سے پرکھتے ہیں کہ فقہ کی رو سے عبادت کے انجام دینے میں کوئی کسر تو باقی نہیں رہی ہے اور امتثال امر فقہ کی نظر میں ہوا یا نہیں۔"

اس کے بر خلاف صوفیہ کا معاملہ ہے کہ وہ اپنے ذوق و وجدان کے ذریعے نتائج عبادت پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ یہ معلوم کریں کہ ان (عبادات) میں کہیں کوتاہی اور خلل تو واقع نہیں ہو گیا ہے۔

غرض، صوفیہ کا اصل طریقہ یہی ہے کہ فعل اور ترک فعل کے باب میں نفس کا محاسبہ ہو اور اس وجدان وذوق کی بات بحث و گفتگو ہو جو مجاہدات سے حاصل ہوتے ہیں پھر جب مرید پورے طور پر ان مجاہدات پر جم جاتا ہے تو اسے دوسرے مدارج کی طرف ترقی حاصل ہوتی ہے۔

نیز ان صوفیہ کے کچھ خاص آداب و اصطلاحات ہیں جن پر دلالت کرنے والے الفاظ انہیں کے حلقہ میں رائج و مشہور ہیں، اس لئے کہ لغت میں جو الفاظ جن معانی کے لئے وضع کئے گئے ہیں، وہ تو متعارف معانی میں مستعمل ہیں اور ضرورت تھی ایسے غیر متعارف معانی و مفاہیم کا سمجھنا جن کی تعبیر سے اوضاع لغویہ قاصر ہیں اس لئے ان کی تعبیر کے لئے ایسے اصطلاحی الفاظ مقرر کئے گئے جن سے ان (صوفیہ) کے مطالب و مفاہیم کو سمجھانا آسان تھا، اور یوں صوفیہ کی اصطلاحات نے ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل کر لی۔

اس طرح علم شریعت کے دو انواع ہو گئے، ایک تو فقہاء اور اہل فتوی سے مختص رہا اور یہ عبادات و عادات اور معاملات کے باب میں احکام عامہ ہیں اور دوسری قسم وہ جو صوفیہ کے گروہ سے مختص رہی جس میں اس مجاہدہ کے لئے قیام ہے، نفس کا محاسبہ ہے، ان ذوق اور جدانیات کے باب میں بحث و کلام ہے جو طریق مجاہدات میں حاصل ہوتے ہیں اور اس بات کا بیان ہے کہ مجاہدہ کے ذریعہ ترقی کرتے ہوئے ایک ذوق و مرحلہ سے دوسرے ذوق و مرحلہ تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے نیز ان اصطلاحات کی شرحیں اس علم میں کی جاتی ہیں جو صوفیہ کے مقرر کردہ اور انہی میں دائر و سائر ہیں۔

علوم کتاب جب شکل میں مدون ہونے لگے اور فقہاء نے فقہ، اصول فقہ اور کلام و تفسیر وغیرہ میں تالیفات کیں تو اس راہ (تصوّف) کے سالکین نے بھی اپنے طریق کے باب میں کتابیں لکھیں۔

ابوالقاسم القشیری (465ھ) کی کتاب "الرسالة القشیریه" کا شمار تصوّف کی بنیاد اور اہم ترین کتب میں ہوتا ہے۔ تصوّف پر بعد میں لکھی گئی اکثر علمی کتابیں اسی ڈھب پر مرتب ہوتی رہیں۔

تصوّف کی اولین ممتاز کتب میں سے ایک ابو نصر سراج (378ھ) کی کتاب "اللمع" ہے اس کتاب میں مضامین پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے زمانے میں تصوّف کے خلاف اعتراضات میں خاصی شدت آگئی تھی۔ مصنف نے اس بات کو ثابت کرنے میں خاصا زور صرف کیا ہے کہ تصوّف کے رہنما اور شیوخ صاحب علم اور اعتدال پر قائم ہیں اور ان کا درجہ اصحاب الحدیث اور فقہاء کے برابر ہے۔

تاج الاسلام ابو بکر محمد الکلابازی (380) کی کتاب "التعریف لمذهب اهل التصوّف" علم تصوّف کی قدیم کتب میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ایجاز و اختصار سے کام لیا گیا ہے اور مختصر جملوں میں صوفیہ کے علوم اور ان کے آداب و مسائل کا تعارف کرایا گیا ہے۔

ابو طالب محمد بن علی بن عطیہ الحارثی المکی (386ھ) کی کتاب" قوت القلوب" تصوّف کے اصولی ادب میں بہت ممتاز ہے۔ اس میں علم کی ماہیت اس کی فضیلت، علم تصوّف اور دیگر پر مسائل عالمانہ و محققانہ گفتگو ہے۔ تصوّف کو ایک باقاعدہ فکر اور مسلک و عقیدہ کی حیثیت دلانے میں امام ابو حامد غزالی (505ھ) نے موثر ترین نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ انہوں نے دینی عقائد و فلسفیانہ تصورت اور عرفانی افکار کے مابین تطبیق پیدا کر کے تصوّف کو اسلامی فکر میں بنیادی جگہ دلوا دی۔ ان کی کتابیں احیاء علوم الدین، مشکوة الانوار، رسالة اللدنیة اور معراج القدس آپ کے امتزاجی نقطہ نظر کی پوری نمائندگی کرتی ہیں۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اسلامی تصوّف میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے حقائق تصوّف کو اس طرح مدون کیا کہ وہ سراسر ایک نیا علم بن گیا۔ ان کی کتابوں میں "فتوحات مکیه" اور "فصوص الحکم" کو لافانی شہرت حاصل ہے۔ ابن عربی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے علم تصوّف کو ایک رمزی اور علامتی زبان عطا کی۔ ابن عربی کے یہاں حکماء و صوفیہ متقدمین کے خیالات کے علاوہ قبل از اسلام کے

حکماء کے خیالات بھی ملتے ہیں اور اسکندریہ کے ہر مسی دبستان اور قدیم رواقیین اور اشر قیین کے تصورات بھی ملے جلے موجود ہیں چنانچہ کائنات، نفسیاتی، منطقی اور حکیمانہ نظریات کا ایک گراں قدر ذخیرہ ان کی کتابوں میں موجود ہے۔

خود آزمائی

سوال نمبر 1: صوفی کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس کے متعلق مختلف آراء کا ذکر کرتے ہوئے ان کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر 2: تصوّف کی ابتداء اور ارتقاء پر جامع نوٹ قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر 3: تصوّف کی چند اصطلاحات بیان کرتے ہوئے ان کی حقیقت پر روشنی ڈالیے۔

یونٹ نمبر 7

اقتصادیات، سیاسیات، عمرانیات

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 115

یونٹ کے مقاصد 116

1-اقتصادیات 117

1.1 تمہید 117

1.2- اسلامی اور مغربی معیشت میں فرق 118

1.3-اسلام میں مال کی افادیت 120

1.4-زر کا مسئلہ 121

1.5-معیشت کی اصلاح اور حکومت کی ذمہ داریاں 122

2-سیاسیات 123

2.1-سیاست کی تعریف 123

2.2-سیاست اسلامی عہد میں 125

2.3-علم سیاست پر ابتدائی مولفین اور ان کی تالیفات 126

3-عمرانیات 128

3.1-عمرانیات کا مفہوم 128

3.2-علم عمرانیات پر مفکرین کی آراء 130

یونٹ کا تعارف

اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریق ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اِدھر اُدھر سے چیزیں لا کر جمع کر دی گئی ہوں بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹی چھوٹی جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی سے متعلق ہر شعبے کے متعلق اسلام میں جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے گئے دیگر مذاہب میں اس کی مثال نہیں ملتی معاشیات کا موضوع ہمیشہ سے علمی دنیا کے مفکرین کے ہاں نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ علماء نے معیشت کے مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک اس سعی کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر دنیا کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ قدیم وجدید نظام ہائے حکومت میں ایک بھی ایسا نظام نہیں بتایا جا سکتا جس کے اقتصادی نظام نے انسانی دنیا کے اندر رفاہیت وخوشحالی اور عدل وانصاف دونوں کو باہم ملا کر امن وسلامتی کا عَلم بلند کیا ہو۔

اس کے برعکس اسلام نے جو معاشی نظام پیش کیا ہے اس کی روح انسانوں کی خدمت، قلبی سکون اور اطمینان ہے۔ اس میں نہ طبقاتی جنگ کی گنجائش ہے اور نہ اونچ نیچ کا وہ غیر فطری فرق موجود ہے جس سے ایک جماعت سرمایہ ودولت کی مالک بن جائے اور دوسری اس کے سامنے دست سوال پھیلا کر فقر وفاقہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔

زندگی کے انہی شعبوں میں سے ایک شعبہ سیاسیات کا ہے۔ اس علم کے بارے میں بنیادی اصول ہمیں قرآن وسنت سے ملتے ہیں۔ مسلمان مفکرین نے دیگر علوم کی طرح اس علم کے ارتقاء میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ارسطو کے اس قول کو بے حد شہرت حاصل ہوئی کہ ''انسان ایک معاشرت پسند حیوان ہے۔ زمانہ آج تک اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے مستغنی نہیں ہو سکتا ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ احتیاجات وضروریات، انسان کے باہمی رشتوں کو مضبوط بناتی ہیں اور ایک سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔ ابن خلدون اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''افرادِ انسان کا اکٹھے مل جل کر رہنا ایک ناگزیر امر ہے اور یہ حقیقت ہے جسے اہل علم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے۔''

نسل انسانی کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک معاشرہ ارتقائی منازل میں داخل رہااور کوئی دور بھی ایسا نہیں گزراجب معاشرتی تنظیم سے مکمل طورپر گریز کیا گیاہو، اس لئے یہ انسانی فطرت وجبلت کے منافی ہے۔ آج دنیامیں مختلف نظام ہائے فکر، ریاست و بادشاہت، جمہوریت اور مختلف تنظیمی شکلیں نظر آرہی ہیں، ان کے پیچھے انسان کا یہی معاشرت پسندی کا جذبہ کارفرمارہاہے۔ اس یونٹ میں آپ معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کے بارے میں مفکرین کی آراء کا جائزہ لیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات تعریفات بیان کر سکیں۔
2. اسلام کے نظام معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات خصوصیات کا جائزہ لے سکیں۔
3. معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کے بارے میں مسلم وغیرہ مفکرین کی آراء کا موازنہ کر سکیں۔
4. عمرانیات کے فن کے ارتقاء میں ابن خلدون اور فارابی کی کاوشوں کو واضح کر سکیں۔
5. ابن مسکویہ، بو علی اور شاہ ولی اللہ کے عمرانیات کے بارے میں افکار کا جائزہ لے سکیں۔

1-اقتصادیات

1.1 تمہید

اللہ تعالی نے حضور اکرم ﷺ کو آخری شریعت دے کر بھیجا جس میں جملہ روحانی و عمرانی ضروریات اور مشکلات کے حل موجود ہیں۔ آپ ﷺ پر یہ شریعت مکمل کر دی گئی، اب زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں رہا جس کے لئے ہدایت کا انتظام نہ کیا گیا ہو چنانچہ انسان کی زندگی کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور اس کی اخلاقی بنیاد قرآن مجید میں قائم کرتے ہوئے مختلف مقامات پر معاشی زندگی کے عملی اصول بھی بیان کئے گئے جن سے معاشی مسائل پر وافر رہنمائی ملتی ہے۔ ان اصولوں کو حضور اکرم ﷺ نے اپنے فرمودات کے ذریعے واضح کیا۔ اس طرح قرآن و حدیث میں دیئے گئے بنیادی اصولوں کی روشنی میں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے زمانے میں پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنے فیصلوں کی نظیریں چھوڑیں جنہیں اسلامی معاشی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا بیش قیمت ذخیرہ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگلے گیارہ بارہ سو سال تک مختلف ممالک میں مسلمان حکومتوں نے اپنے معاشی معاملات کو شریعت کے بنیادی اصولوں کی روشنی ہی میں استوار کیا۔ مسلمانوں کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ سے بہت سے ایسے اصولوں کی نشاندہی ہوتی ہے جس سے بدلتے ہوئے حالات میں شریعت کے انطباق کے طریقوں پر روشنی پڑتی ہے۔

کئی مغربی مفکرین مسلمانوں کے علوم کو یونانی علوم سے ماخوذ ثابت کرتے ہیں جن میں مسلمانوں کے معاشی علوم بھی شامل ہیں۔ مسلمانوں نے بلا شبہ یونانی علوم سے اکتساب کیا اور انہوں نے جابجا اس کا اعتراف بھی کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بلاد اسلامیہ میں یونانی علوم کی اشاعت سے پہلے بھی انفرادی و اجتماعی اور ریاستی و تجارتی سطح پر ایک سادہ سا معاشیاتی ڈھانچہ اساسی طور پر قرآن مجید، احادیث نبوی اور تعامل صحابہ پر قائم کیا گیا تھا جس میں جوں جوں وقت گزرتا گیا ،نئے نئے واقعات اور زمانے کے جدید تقاضوں کے تحت وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔ المقریزی کی "الخطط"، القلقشندی کی "صبح الاعشی" ابن مماتی کی "قوانین الدواوین" اور ابوالفضل کی "آئین اکبری" جیسی کتابوں کے مطالعے سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہد اسلام میں ایسے مستحکم معاشیاتی اور مالیات نظام موجود تھے جو تجارت، محصولات، نظام ٹیکس،

بینکاری اور کارپوریشنز (Corporations) کی طرح کے اداروں پر مشتمل تھے۔ بنو عباس کے زمانے میں زنج کی بغاوت بھی زرعی معاشیات کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے جس میں ارضی معاشیات کے کئی سبق ملتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے زرعی محاصل و ملکیت کے بارے میں جو احکام نافذ کئے اور عہد بہ عہد ان پر عمل اور کہیں ان سے انحراف ہوا، اس سے بھی زراعتی معاشیات کے کئی اصول نکلتے ہیں۔

مسلم اقوام وقتاً فوقتاً دنیا کے مختلف گوشوں اور خطوں سے اٹھتی اور اقتدار پر قابض ہوتی رہی ہیں۔ یہ اقوم اپنے قبائلی نظامات بھی اپنے ساتھ لاتی رہیں جن کے باعث معاشیات کی صورتیں بھی بدلتی رہیں اور معاشرہ کبھی فوجی، کبھی زرعی اور کبھی جاگیردارانہ انداز اختیار کرتا رہا۔ بایں ہمہ یہ مسلم ہے کہ معاشیات کے شرعی حصے (یعنی زکوٰۃ، عشر وغیرہ) پر بلاانقطاع عمل ہوتا رہا اور اسلامی تاریخ سرمایہ دارانہ معاشی ذہن سے تقریباً آزاد رہی ہے۔ محدود نجی ملکیت کے اصول کو بھی ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا اور سرمایہ داری اور سود خوری جیسی لعنتوں سے معاشرہ اکثر پاک رہا۔

1.2-اسلامی اور مغربی معیشت میں فرق

اسلامی معاشیات کا بنیادی ڈھانچہ جدید اور مغربی معاشیات سے بالکل مختلف ہے۔ مغربی معاشیات میں تمام علم انسانی تجربات اور ان کے عقلی تجزیئے پر مبنی ہے جو تغیر پذیر، ناقابل اعتبار اور غیر یقینی ہے جب کہ اسلامی معاشیات کی بنیاد قرآن و حدیث اور امت کے تقریباً پندرہ سو سال کے عمل پر ہے۔ ان عناصر کے امتزاج سے جو ڈھانچہ تیار ہوتا ہے وہ ہر دور کے مسائل کے لئے ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔

مغربی معاشیات میں تمام نظریات کو صرف مشاہداتی اور عملی شواہد کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے اور جو نظریات عقلی اور مشاہداتی طور پر رد نہ کئے جا سکیں ان کو سچا مان لیا جاتا ہے تاآنکہ ایسے حالات پیدا ہوں کہ کچھ دوسرے شواہد کی نفی کر دیں لیکن اسلامی معاشیات میں تمام نظریات کو شریعت الٰہی کے بنیادی ڈھانچے پر جانچا جاتا ہے۔ یہ وہ کسوٹی ہے جو کسی نظریے کے سچ یا جھوٹ ہونے پر حتمی فیصلہ دیتی ہے۔ البتہ ایسے تمام معاملات میں جن کے بارے میں شریعت میں کوئی مخصوص علم موجود نہیں ہے، وہاں شریعت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے اور یہ اجتہاد بوقتِ ضرورت قیاس، رائے استحسان، مصالح مرسلہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

اسلامی معاشیات اور مغربی معاشیات میں ایک اور بڑا فرق یہ ہے کہ مغربی معاشیات مشاہداتی حقائق کے بیان اور ان کی وقتی تعبیر سے غرض رکھتی ہے مگر اس تجزیے کی روشنی میں کوئی لاحقہ عمل یا طریق کار بیان کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے لیکن اسلامی معاشیات حقائق کے تجزیے کے علاوہ لوگوں کے لئے مطلوبہ لائحہ عمل بھی بیان کرتی ہے اور ان معنوں میں یہ ایک معیار علم ہے۔ اسلام اپنی حکمت کی روح سے ایک عملی نظریہ ہے۔ اس میں صرف قیل و قال یا بحث تمحیص کا کوئی مقصد نہیں بلکہ شریعت میں ایسی بحث وہ تمحیص سے روکا گیا ہے جس کا مقصد عملی اقدام کے لئے روشنی حاصل کرنا نہ ہو۔

مغربی معاشیات میں انسان کی مادی زندگی ہی اصل حیثیت رکھتی ہے۔ بینتھم (Bentham) مل (Mill) اور ریکارڈو (Ricardo) جیسے مفکرین نے مادی افادیت کے نظریے کا پرچار کیا اور بالآخر یہ نظریہ مغربی معاشیات کا ایک بنیادی جزو بن گیا۔ انسان کی مادی زندگی بلا استثناء اور بلا کیف اتنی اہم تصور کر لی گئی کہ انسان کو معاشی حیوان (Economic Animal) مانا جانے لگا لہذا معاشی اعمال اور معاشی فوائد ہی مقصود و مطلوب ٹھہرے اور اب دنیا میں معاشی معاملات ہی سب کچھ ہیں۔

اسلامی معاشیات میں معاشی عمل انسان کی کل زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس میں زندگی مقاصد جلیلہ کے لئے ہے اور معاش ان مقاصد کے تکمیل کے عمل میں ایک پرزہ ہے یہی امر قابل توجہ ہے کہ انسان کے قاعدے اور ضابطے، جو معاشی عمل کی رہنمائی کرتے ہیں وہ اصلاً اخلاقی ہیں، انہیں جائز و ناجائز یا حلال و حرام کی اصطلاحوں میں پیش کیا گیا ہے۔ گویا اسلام میں معاش کو خالق کنٹرول کرتا ہے جو کہ معاشی و معاشرتی تعدیل کا ذمہ دار ہے۔

چونکہ انسان صرف معاشی حیوان نہیں لہذا اس کے اخلاق و روح کو فروغ دینے کے لئے جن انتظامات کی ضرورت شریعت نے مناسب سمجھی ہے، وہ حلال و حرام کے ضوابط کی شکل میں نازل کئے۔ مثال کے طور پر اگر کسی علاقے میں انگوروں کی کاشت وسیع پیمانے پر ہوتی ہے تو مغربی معاشیات کے تجزیے کے مطابق وہاں شراب کی صنعت لگانا ایک سود مند عمل ہوگا لیکن اسلامی معاشیات کسی ایسی تجویز پر غور نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اسلام کے ضوابط حلال و حرام کے منافی ہے۔ حلال و حرام کا یہ تصور مغربی معاشیات میں سرے سے عنقا ہے۔ وہاں پر انسان اپنے تمام معاملات میں خود مختار ہے اور کسی بالائی ضابطہ کو اس کی آزادی سلب کرنے کا کوئی حق نہیں الا یہ کہ وہ کسی دوسرے انسان کی آزادی پر تصرف کر رہا ہو۔ زندگی کو اس کی مرکزی حیثیت سے ہٹا کر صرف ایک پہلو کی حیثیت سے دیکھنے کے مغربی

تصور سے اسلامی معاشی اقدار اور مغربی معاشی اقدار میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے، ان مختلف اقدار کی روشنی میں جو معاشرے برپا ہوتے ہیں تاریخ میں ان کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک طرف خلفائے راشدین کا دور ہے جو اسلامی اقدار کے بھرپور ملی انطباق کا زمانہ ہے اور دوسری طرف موجودہ دور کی مغربی معیشت جو کہ مغربی افکار کے مکمل نفاذ کا مظہر ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم کسی دور کو پسند کرتے ہیں، ان کا باہمی اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشیات اور مغربی معاشیات بالکل مختلف بنیادوں پر استوار ہیں۔ ان کا نفس مضمون، ان کا طریق تجزیہ، ان کے بنیادی مفروضات اور ان کے نتائج ایک دوسرے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔

1.3-اسلام میں مال کی افادیت

اسلام میں مال کی افادیت یہ ہے کہ اس کی مدد سے انسان اپنی ضرورتیں پوری کر سکے اور متوسط درجے کی خوشحال زندگی بسر کرتے ہوئے معاشرے کی خوشحالی اور تقویت کا باعث بن سکے اور مال کی بنا پر تفاخر، نمود و نمائش، اسراف، استحصال یا انسانی خوف، مجبوریوں اور ضرورتوں کی بناء پر ناجائز فائدہ اٹھانے کا ذریعہ نہ بن جائے۔ اسلام میں دولت کا مقصد عام ضروریات زندگی کو پورا کرنا، انفاق فی سبیل اللہ، مسلم ریاست کو چلانا، سرحدوں کی حفاظت کرنا اور نادار طبقوں کی کفالت ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے سلاطین و ملوک نے شان و شوکت پر بھی زور دیا تاہم کولبرٹ (Colbert) جیسے مغربی مفکرین کا خیال ہے کہ اقتدار میں سرکش عناصر کو دبانے اور مخالفین پر رعب ڈالنے کے لئے اس زمانے میں شان و شوکت ایک لازمی شے سمجھی جاتی تھی۔ البتہ مسلم معاشرے نے میکیاولی (Machiavelli) کی طرح سلاطین کو کبھی اخلاقیات سے بالا خیال نہیں کیا۔ وہ بہر حال کسی نہ کسی رنگ میں معاشرے کے سامنے جواب دہ تھے۔

مسلمانوں میں تخیل یطوبی (Utopian) انداز میں سوچنے والے لوگ بھی گزرے ہیں مثلاً فقراء اور فرقہ مہدویہ کے پیرو، جو کسب اور مساوات کامل کے موید تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ دینی سلسلے کے لوگ تھے، اس لئے انہیں معاشی فکر میں کوئی مقام نہیں دیا جا سکتا تاہم انہوں نے ایک نہج ضرور بتائی اور ایک معاشی مساواتی مسلک کی نشاندہی کی۔ یہ مساوات نفرت کے زور پر پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ اس کی بنیادیں روحانی اور تالیف قلوب پر مبنی تھیں۔ بعض معاشی روشیں سیاسی تھیں مثلاً وہ جو بابک خرمی یا اسماعیلیہ کی بعض شاخوں نے اختیار کیں لیکن معین اور باضابطہ معاشی

دستور العمل فقہاء کی کتابوں سے ملتا ہے جن میں معاشی شقوں کی شرع کا حصہ بنادیا گیا ہے اور تصور یہ ہے کہ معاشیات کو معاشرت واخلاق اور دین سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

1.4-زر کا مسئلہ

آنحضرت ﷺ کے دور میں جنس کا جنس سے مبادلے کا دستور بھی تھا اور بطور وسیلہ مبادلہ دھات (سونے یا چاندی وغیرہ) اور دھات کے سکوں (درہم ودینار) کا بھی۔ آنے والے ادوار میں مسلمانوں کے ہاں تجارت میں ان دونوں کے رواج کے شواہد ملتے ہیں تاہم ہر دور میں سکے کی معیاری حیثیت رہی چنانچہ اسلامی سلطنتوں میں جگہ جگہ ٹکسال کی موجودگی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ دراصل سکہ ہی دولت کی بہترین محسوس شکل ہے کیونکہ اس سے نہ صرف ہر چیز خریدی جاسکتی ہے بلکہ اسے آسانی سے ذخیرہ اور منتقل بھی کیا جاسکتا ہے تاہم حکمائے اسلام کی نظر میں اسے بجائے خود کوئی شرف یا برتری حاصل نہیں۔ یہ محض ایک وسیلہ مبادلہ ہے جو دوسرے عاملین پیدائش کے بغیر کوئی چیز پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ مزید برآں اسلام میں سونے چاندی یا روپے کے ذخیرے فراہم کرنے یا انہیں دبائے رکھنے پر انتہائی نفرت اور کراہت کا اظہار کیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے صرف اس زر یا دولت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے جو گردش میں رہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زراعت، تجارت اور صنعت میں ذوق کے اعتبار سے مسلم ملکوں میں ترجیح تجارت کو حاصل رہی ہے۔ بین العلاقائی تجارت اور بھی مفید خیال کیا جاتا تھا جہاں مسلم تاجر دیگر ممالک میں تبلیغ اسلام کا ذریعہ بھی بنتے تھے عام معاشیاتی کی طرح مسلمانوں کی تجارتی بھی ضابطہ اخلاق اور احکام شریعت کی تابع تھی۔

مسلمانوں نے دور فتوحات میں اراضی کے مسائل پر بھی غور کیا اور زمین کو دولت یا دولت کے ذریعے کے طور پر دیکھ کر قوانین اور قواعد وضع کئے۔ اس سلسلے میں حضرت عمر کے فیصلے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جن کی تفصیلات امام ابو یوسف کی "کتاب الخراج" میں ملتی ہے۔ یہ فیصلے کم وبیش شرعت اسلامیہ کا حصہ بن گئے ہیں۔

1.5-معیشت کی اصلاح اور حکومت کی ذمہ داریاں

اسلامی حکومتوں میں صنعت کی حیثیت ہمیشہ آزاد رہی ہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے تاہم وہاں صنعت نے کارخانہ داری کی موجودہ صورت اختیار نہیں کی اور نہ اس سلسلے میں مزدور اور محنت (Labour) کے مسائل پیدا ہوئے۔ اسلام کے معاشی تصورات کی رو سے پیدائش دولت میں افراد آزاد ہیں لیکن ریاست صرف نگرانی کے فرائض سرانجام دیتی ہے۔

اس سلسلے میں مسلم مفکرین میں سے الماوردی اور شاہ ولی اللہ کی آراء ملاحظہ کیجیے۔

الماوردی (متوفی 364ھ) نے احکام السلطانیہ میں امام کے حقوق و فرائض کے ضمن میں جہاں رعیت پر امام کی مدد و اطاعت واجب ٹھہرائی ہے وہاں امام کے لئے بھی یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ رعایا کے حقوق کی نگہداشت کرے، ان پر نہ خود ظلم کرے اور نہ ان پر ظالم اہلکار مسلط کرے بلکہ انصاف کرنے کے لئے قاضی، انتظامی امور کے لئے وزراء اور دیگر عمال اور زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کے لئے محصلین کا تقرر نہایت دیانتداری اور احتیاط کے ساتھ کرے۔

شاہ ولی اللہ نے حجتہ اللہ البالغہ میں حکومت کے فرائض کی بحث میں مکاسب معاشی اور پیسوں کی تقسیم کی خرابی اور بگاڑ کو نظام تمدن کے بگاڑ اور اختلال سے تعبیر کیا ہے اور حکومت وقت کی یہ ذمہ داری بتائی ہے کہ وہ ان پیشوں کی تقسیم پر نظر رکھے اور ان میں افراط و تفریط نہ پیدا ہونے دے۔

جہاں تک مسلمانوں کی عملی معاشیاتی کا تعلق ہے، اس کی تفصیل مختلف موضوعات کی تصنیفات میں بکھری پڑی ہے۔ مثلاً کتب فقہ میں اس سلسلے میں امام شافعی کی "کتاب الام" فقہ مالکی کی "المدونة" فقہ حنفی میں امام محمد اور امام ابو یوسف کی کتابیں السرخسی کی "المبسوط" المرغینانی کی "هدایه" ابن حزم کی فقہی تصانیف اور ہندوستان کے آخری دور میں " فتاویٰ عالمگیری" بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان قدیم کتابوں کے علاوہ ترکی کی خلافت عثمانیہ کے " مجله الاحکام العدلیه" عرب ممالک کے جدید علماء کی اس موضوع پر کتابوں اور مسلمان سیاحوں کے سفر ناموں میں مسلمانوں کے تمدن اور مالیات کے سلسلے میں ان کے تجربوں کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں مصری موسوعات نگار القلقشندی کی "صبح الاعشی" میں معاشیات و مالیات کے اداروں پر نہایت عمدہ معلومات دستیاب ہیں۔

خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1: اسلامی معاشیات کے ارتقاء پر جامع نوٹ قلمبند کیجیے۔

سوال نمبر 2: کیا اسلامی معاشیات نے مغربی معاشیات کے اثرات قبول کئے ہیں؟ اپنا جواب مدلل انداز میں پیش کیجیے۔

سوال نمبر 3: اسلامی معاشیات کے بنیادی مصادر کا تعارف کروایئے۔

2-سیاسیات

2.1-سیاست کی تعریف

علامہ ابن خلدون سیاست کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"سیاست اس ذمہ داری کا نام ہے جس کی رو سے عام انسان نگہداشت کا کام پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ جس کے ذریعے خود کی نیابتی حکومت بندگان خدا میں خدا کے قوانین کو نافذ کرتی ہے اور احکام کا اجراء عمل میں لاتی ہے اس کام میں انسان کی بہتری اور مفاد عامہ کا لحاظ رکھتی ہے اور قانون (شرائع) کو فیصلہ کن قوت تسلیم کرتی ہے۔"

سیاست کی اس تعریف کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے سیاست کا تعلق حکومت و سلطنت کے کاروبار سے ہے جس سے مصالح عامہ کی تکمیل اور عام بندگان خدا کی حالت میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔

علامہ ابوالبقاء حنفی سیاست کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"وہ کام جس کا مقصد انسان کی بہتری کے لئے ایک ایسا راستہ پیدا کرنا ہے جو حال اور مستقبل کی رہنمائی کے لئے ضمانت دے سکے۔ سیاست انبیاء کی ذمہ داری ہے جو اپنے عام اور خاص، ظاہری اور باطنی دائرہ میں اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح حکمران صرف ظاہری حلقہ اثر میں اس ذمہ داری کے مالک ہوتے ہیں۔"

علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ انسانی سر گرمیوں کا دار و مدار تین حقیقتوں پر ہے:

اول: (عمارۃ الارض) روئے زمین پر عمرانی تمدن کے بروئے کار لانا پر۔

دوم: (خلافت) اسلامی طرز کی نیابتی حکومت پر جو خدا کے اقتدار اعلی کی مکمل اطاعت کرے۔

سوم: (مکارم شریعت) اسلامی قوانین کے اعلی اوصاف پر۔

علامہ راغب کے نظریے کی رو سے سیاست کی دو قسمیں ہیں:

"فرد کی سیاست اور سوسائٹی کی سیاست۔ سوسائٹی کی سیاست سے پہلے فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ سیاسی کردار میں کامل ہو۔ جو فرد ذاتی طور پر بہتر سیاست پر قادر نہیں ہے وہ حکومت کی سیاست کے جہاز کو نہیں چلا سکتا۔ حکومت کا نظام چلانے کے لئے قانون کا علم بھی ضروری ہے اور قانون کے ساتھ سیاست عامہ کا جاننا بھی لازمی ہے"۔

ابوالحسن ماوردی اسلامی سیاست اور طرز حکومت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسلامی حکومت ایک قسم کی قیادت ہے۔ جو دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست پر مبنی ہے گویا دین کی حفاظت کے بعد دنیا کے کاموں میں اس کا حصہ لینا سیاست پر موقوف ہے۔ اسلامی حکومت کے قائد کے لئے سیاست ایک خدائی آلہ ہے جس کا کام اجتماعی نظام کا اتحاد ہے"۔

علامہ ماوردی اس رائے پر بھی زور دیتے ہیں کہ قانون شریعت کا تعلق ذمہ داریوں سے ہے اور سیاست کا دنیا کی تعمیر سے۔

شاہ ولی اللہ نے اسلامی زندگی کے سیاسی محرکات کو حکیمانہ طرز بیان کے ساتھ پیش کیا ہے وہ تصریح کرتے ہیں کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی کا تعلق سیاست سے ہے اور سیاست کی اساس معتدل واجبات پر ہے۔ انبیاء کی جد وجہد کا دارو، دار بھی در حقیقت دو چیزوں پر رہا ہے۔ صحیح انسانی تہذیب اور امت کی سیاست۔

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں سیاست وہ فن ہے جو حکومت کے واجبات اور سلطنت کے نظم و نسق سے تعلق رکھتا ہے مسلمانوں نے مدتوں سیاست و حکمت کا قانون روشن رکھا۔ اور دنیا کے موجودہ سیاسی شعور میں جو عمومیت اور حکومت کے قالب میں اختیارات کو جو قوت نظر آتی ہے اس میں اسلام کے سیاسی دور کا بڑا دخل ہے۔

2.2-سیاست اسلامی عہد میں

اسلامی عہد میں حضرت ارقمؓ کے مکان پر خفیہ اجتماع سے امت کی تنظیم کا نتیجہ خیز کام شروع ہوا تھا جس کی تکمیل اس وقت ہوئی جب مدینہ نبوت اور خلافت کا پایہ تخت بن گیا۔ مکہ میں ملت ابراہیم کی شیرازہ بندی، بین الاقوامی تعلقات کے لئے اصول ہجرت کا اجراء اور اسلامی معاشرے کے استحکام کے لیے اصول بیعت (اجتماعی حلف) کا نفاذ، مدینہ میں انصار و ماہرین کے درمیان بھائی چارہ کی تشکیل بدر کی جنگ حدیبیہ کی صلح، مکہ کی فتح اور اس کے بعد انسانی مساوات امن آزاد اور اخوت کا اعلان، سلاطین عالم کے دربار میں سفراء کی روانگی بیرونی سفراء کی مدینہ میں باریابی، صوبائی تنظیم، حکام کا تقرر، فرامین کا اجراء سقیفہ کی مجلس شوریٰ میں رائے عامہ سے منصف حکومت کا فیصلہ، ایسے امور ہیں جن کا تعلق سراسر اسلامی سیاست سے ہے۔

عہد نبوی میں سیاست کے بنیادی اصول متعین صورت میں بروئے کار آئے اور خلافت راشدہ میں سیاسی حکمت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ کر مشرق و مغرب کے سر پر طلوع ہوا۔

خلیفہ چہارم حضرت علی ابن ابی طالب کے بعد سیاست (طریق و تنظیم امور ریاست) کا انداز مختلف ہو گیا۔ ریاست کے اصولی نظریئے کے ساتھ ریاست کے طریقے بھی مختلف و متنوع ہوتے گئے۔

اس موقع پر یہ تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ مسلمانوں کا تصور سیاست اپنے خاص ماحول سے ابھرا ہے اور دین کے سرچشموں (قرآن و سنت اور تعامل صحابہ کبار) سے سیراب ہوا ہے۔ بعض مغربی اہل علم کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کا تصور سیاست حکماء یونان افلاطون وارسطو وغیرہ کے تصور پر مبنی ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ یہ تصور ساسانی اور رومن نظریات کا مرہون منت ہے۔ مسلم حکماء نے اگرچہ یونانی اور دوسرے علوم سے بھی استفادہ کیا مگر مملکت اور تمدن کی روح کے اعتبار سے اسلامی تصور ریاست کا سارا ڈھانچہ بالکل منفرد اور سب سے مختلف تھا۔

بلاشبہ مسلم حکماء افلاطون کی جمہوریت اور ارسطو کی سیاسیات سے واقف تھے۔ ابن ابی الربیع اور فارابی کی تصانیف میں بھی یونانیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن ان میں سیاست و ریاست کی عملی تعبیر یونانی تصورات سے قطعاً مختلف ہے۔ اقتدار اعلیٰ ہی کی بحث کو لیجیے۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ صرف خدا کی ذات میں مرکوز ہے، انسان خدا کا نائب ہے۔ یونان میں خدا کا یہ تصور موجود ہی نہیں تھا، ارسطو کا تصور سیاست ''شہری ریاست'' نہایت محدود ہے۔ اس میں اسلام کا عالمگیر نصب

العین نایاب ہے۔ابن ابی الربیع تک کی کتاب میں روح سیاست مختلف ہے۔ منجملہ دیگر امور کے اسلام کا قانون سیر ،یعنی بین الاقوامی قانون ہی اس قدر ممتاز ہے کہ یہی اسے دیگر تمام نظریات ریاست سے جدا اور منفرد رکھنے کے لئے کافی ہے۔

مسلمان حکماء نے اگرچہ یونانیوں کی بعض اصطلاحات اپنائی ہیں۔ مگر عملاً مسلمانوں کے تصور ریاست اور اصول سیاست پر ان کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔اسلامی حکومت کے اصول اور اس کی بنیاد اصول ربوبیت، فلاح عامہ، عدل وانصاف، اخوت و مساوات اور رضاءالٰہی پر ہیں۔ ربوبیت کا اصول یونانی اور موجودہ یورپی فکر سے بالکل غائب ہے۔ بعض اصطلاحی مماثلتوں کے باوجود مسلمانوں کی سیاست کا مثالی نمونہ سیاست نبویؐ اور سیاست خلفائے راشدین ہے اور جب مسلمانوں میں خلافت کے بجائے سلطنت کا رنگ ڈھنگ پیدا ہو گیا تب بھی ان کے ہاں مثالی نمونہ ارسطو اور افلاطون کی ریاست نہ تھا بلکہ حاکم اعلیٰ کے تقرر کے سوا اس کا رخ اور منہاج اسلامی ہی رہا۔انتظامی ادارے اور شعبے تمدنی اور حکومتی ضرورتوں کے مطابق قائم ہوئے نہایت عمدہ تنظیمات ہر شعبے میں وجود میں آئیں۔

2.3-علم سیاست پر ابتدائی مولفین اور ان کی تالیفات

مسلم حکماء نے سیاست اور حکمرانی کے اصول، ڈھانچے اور طریقوں کی بحث مختلف کتابوں میں کی ہے اس یونٹ میں ہم سیاست کے موضوع پر خصوصی طور پر لکھی ہوئی کتابوں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

حضرت معاویہ کے عہد میں پہلی سیاسی تاریخ "کتاب الملوک" حکومت کی نگرانی میں لکھی گئی اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے علم سیاست پر توجہ شروع ہو گئی تھی۔

تیسری صدی ہجری میں ابن قتیبہ الدینوری (متوفی376ھ) نے "عیون الاخبار" میں نظام سلطنت پر ایک مستقل کتاب تحریر کی اور اس میں سیاسی معاملات، قانون مشاورت، عمال سلطنت اور احکام ولایات کے متعلق مباحث درج کئے۔

چوتھی صدی کے آغاز میں علامہ ابو نصر فارابی (339ھ) نے متمدن شہریت اور مبادی سیاست پر اپنی بلند پایہ کتاب"مبادی آراء اہل المدینہ الفاضلہ" تحریر کی۔

اسی صدی کے وسط میں"رسائل اخوان الصفاء"قلم بند ہوئے اخوان الصفا نے سیاست کو ایک مستقل فن قرار دیا۔

چوتھی صدی ہی میں ابو الحسن علی بن الاہوازی سیاست کے میدان میں ایک مجدد کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔انہوں نے سیاست کو سب سے پہلے علم کی حیثیت دی اور قانون سیاست کو مدون کیا۔ان کی نادر روزگار تصنیف کانام "التبر المنسبک فی تدبیر الملک / تہذیب الرئاسہ و ترتیب السیاسۃ" ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں ابو الحسن ماوردی (متوفی450ھ) نے"الاحکام السطانیہ"کے نام سے سیاست و امامت کے قوانین پر ایک اہم کتاب لکھی۔ اسی دور میں قاضی ابو یعلیٰ (458ھ) نے بھی اس فن پر "الاحکام السطانیہ"کے نام سے کتاب تصنیف کی۔

پانچویں صدی کے آخر میں امام راغب اصفہانی (502ء) نے اپنی بلند پایہ کتاب"الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ" میں سیاست وسلطان کاذکر کیااور اسلام کے شوروی رجحان پر بحث کی۔

اسی صدی میں فخر الدین الطقطقی(709ھ) نے سیاسیات"الفخری فی الآداب السطانیہ و الدول الاسلامیہ" کے عنوان سے کتاب لکھی جس میں اسلامی تاریخ کے سیاسی عوامل کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔

ساتویں صدی میں شیخ ابن العربی (238ھ) نے "کتاب التدبیرات الالہیہ في أصلاح المملکۃ الإنسانیۃ" تحریک جس میں انسانی سلطنت کے تصور پر سیاسی بحث کی گئی ہے۔

آٹھویں صدی ہجری میں ابن تیمیہ (728ھ) نے"السیاسۃ الشرعیۃ"اور ان کے شاگرد ابن قیم الجوزی (756ھ) نے"الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشریعہ"تصنیف کیں۔

بارہویں صدی ہجری میں شاہ ولی اللہ نے"حجۃ اللہ البالغہ"کے نام سے اپنی معرکۃ الآراء کتاب تحریک کی جس میں سیاست شریعہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

خود آزمائی نمبر2

سوال نمبر1: اسلام کا طرز حکومت بیان کرتے ہوئے اس کی خصوصیات پر نوٹ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر2: علم السیاسۃ کی تدوین وارتقاء میں مسلمان مفکرین کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر3: کیا خلافت علی سبیل التوارث (نسلی حکومتوں) کا اسلام میں کوئی تصور موجود ہے؟ مفصل بحث کیجیے۔

3-عمرانیات

3.1-عمرانیات کا مفہوم

عمرانیات (Sociology) کی علمی اصطلاح کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے عربی زبان کی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف الفاظ مروج رہے ہیں۔ ظہور اسلام کے وقت اور اس سے کچھ عرصہ قبل تک بدو یا بداۃ (خانہ بدوش اور صحرا نشین کی زندگی) کے مقابلے میں، حضر اور حضارۃ (متمدن اور شہری زندگی گزارنے والے علاقے) کے الفاظ مستعمل رہے۔ اس کے علاوہ ایک ساتھ اجتماعی زندگی گزارنے کے لئے معاشرے اور تعاشر مستعمل رہا ہے۔ غالباً ابن خلدون پہلا عالم ہے جس نے معاشرے یا سوسائٹی (Society) کے لئے عمران کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اپنے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

"عمران کا مادہ عمر ہے، جس کے معنی ہیں تعمیر کرنا، آباد کرنا، عمران کا اطلاق کسی بھی ایسی آبادی پر ہو سکتا ہے جو منفرد وحشیانہ زندگی سے برتر ہو جاتے۔ عمران کے وجود میں آنے کی شرط یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی ایک تعداد اپنی خداد صلاحیت فکر کے مطابق باہمی تعاون شروع کر دے اور ایک قسم کی معاشرتی تنظیم قائم ہو جائے۔"

مسلم مفکرین اور علماء کے عمرانی نظریات کے ذکر سے پہلے قرآن مجید اور حدیث نبوی میں اس سلسلے میں جو کچھ وارد ہوا ہے اس پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہو گا قرآن مجید کی رو سے کرہ ارض پر انسانی معاشرے کا قیام ایک اعلیٰ وارفع مقصد کے لئے ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کا جانشین یا خلیفۃ اللہ علی الارض کی حیثیت سے اللہ کی منشا پورا کرتے ہوئے اپنے علم کی روشنی کے ذریعے کائنات کی تسخیر کرے۔

{وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ O وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ O قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ O قَالَ يَاآدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ

لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ }[25]

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں (تو) انہوں نے کہا: کیا تو بنائے گا اس میں (اسے) جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خون بہائے گا اور ہم تسبیح بیان کرتے ہیں تیری تعریف کے ساتھ اور ہم پاکی بیان کرتے ہیں تیری (تو اللہ نے) فرمایا: بے شک میں (وہ کچھ) جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے آدم کو سکھا دیے وہ سب نام (جو چاہے) پھر پیش کیا ان کو فرشتوں پر پس فرمایا (اللہ نے) مجھے بتاؤ ان چیزوں کے نام اگر ہو تم سچے۔ (وہ) کہنے لگے: تو پاک ہے کوئی علم نہیں ہمیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے بے شک تو ہی خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔ اللہ نے) فرمایا اے آدم بتا دو انہیں ان کے نام تو جب اس نے بتا دیے انہیں ان کے نام (تو اللہ نے) فرمایا کیا نہیں میں نے کہا تھا تمہیں کہ بے شک میں ہی جانتا ہوں غیب (کی باتیں) آسمانوں اور زمین کی اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم ہو چھپاتے۔"

قرآن مجید کی رو سے انسانی معاشرے کے تمام افراد نفس واحدہ سے پیدا ہوئے اس لئے سب برابر ہیں۔ قبائل کی جو تقسیم ہے اس کا مقصد صرف جان پہچان کی سہولت ہے۔

{يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا}[26]

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے ایک جان (آدم) سے اور اس نے پیدا کیا اس جان سے اس کا جوڑا اور پھیلا دیے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو اللہ سے جو (کہ) تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اس کا واسطہ دے کر اور رشتوں کو توڑنے سے بھی ڈرو بے شک اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

---

[25] [البقرة: 30 - 33]

[26] النساء: 1

رسول اکرم ﷺ نے قرآن مجید کے پیغامات توحید اور وحدت نسل انسانی کے تصور کی روشنی میں جو اسلامی معاشرہ تشکیل دیا اس میں نسل پرستی یا رنگ کی برتری کی گنجائش نہیں۔ آپ نے قومی یا علاقائی تعصب کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

"لیس منامن دعا الی عصبیة"

(تعصب کی دعوت دینے والا ہم میں سے نہیں ہے)

اسلام علوم کی تاریخ میں ابن خلدون (808ھ) نے سب سے پہلے عمرانیات کو ایک علم کی حیثیت سے نہ صرف دریافت کیا بلکہ اس کے اصول و مبادی وضع کر کے اسے ایک مستقل فن کی شکل عطا کی لیکن ابن خلدون سے پہلے بھی علمائے اسلام کے ہاں عمرانیات یا علم الاجتماع کے بارے میں اشارات ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ہاں تفصیلی اشارات ملتے ہیں اور بعض کے ہاں ضمنی اور مختصر۔

3.2- علم عمرانیات پر مفکرین کی آراء

عمرانیات کے موضوع پر علماء اسلام میں سے جن اہل علم نے مفصل معلومات چھوڑی ہیں یا جن کے ہاں اس بارے میں تفصیلی اشارات ملتے ہیں ان میں الفارابی ،ابن مسکویہ ،ابن سینا،ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں ان کے افکار کا مختصراً جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

1. محمد بن ترخان ابو نصر فارابی (متوفی950ھ) نے "آراء اهل المدينة الفاضلة" کے نام سے ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے اور اس میں ایک مثالی ریاست اور مثالی انسانی معاشرے کا خاکہ پیش کیا ہے۔

الفارابی کے نزدیک انسانی معاشرے کا قیام درحقیقت انسان کی فطری ضرورت بھی ہے اور مرتبہ کمال کے حصول کا ذریعہ بھی۔ اس کی رائے میں "جو کمال انسان کی پیدائشی فطرت کا تقاضا ہے، اس کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بڑی بڑی انسانی جماعتیں اکٹھی ہو کر تعاون کی زندگی گزارتے ہوئے ایک دوسرے کی ضروریات پور اکرنے کے لئے آمادہ کار نہ ہو جائیں"۔ الفارابی انسانی معاشرے کے مسلسل اور وسیع تر ارتقاء کے لئے افراد معاشرے کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے تعاون پر زور دیتا اور روئے زمین پر انسانی معاشرے کے قیام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے

لکھتا ہے کہ فرد، معاشرے کے مفاد میں کام کرتا ہے اور معاشرہ فرد کی بھلائی کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور اس طرح معمورہ عالم پر بڑے بڑے انسانی اجتماعات اور معاشرے وجود میں آتے ہیں۔

2. ابو علی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ (متوفی1030ھ) نے اپنی کتاب "الفوز الأصغر" میں عمرانیات کے بعض پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ وہ انسانی معاشرے یا عمران کے لئے تمدن کی اصلاح استعمال کرتا ہے فلاسفہ یونان کے نظریئے "انسان مدنی الطبع ہے" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "انسان فطری اور پیدائشی طور پر اپنے ابنائے جنس کے مختلف النوع تعاون کا محتاج ہے اور یہ تعاون اور باہمی معاونت کی صورت شہری زندگی کے سبب عملی شکل میں ہی سامنے آسکتی ہے۔ کسی جگہ تعاون کی بنیاد پر انسانوں کا اکٹھا ہونا ہی 'تمدن' (سوسائٹی) کہلاتا ہے۔ خواہ یہ کسی بستی میں ہو یا شہر میں، یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر"۔

ابن مسکویہ کے نزدیک ہر انسان اپنے ابنائے جنس کے لئے فائدے کا سبب ہے اور کوئی فرد بھی اپنے ہم جنسوں سے بے نیاز و مستغنی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے کوئی فرد بشر الگ تھلگ یا منفرد زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جبکہ دیگر حیوانات اپنی خلقت کے حوالے سے ان لوازمات میں خود کفیل ہیں، مثلاً ہر جانور پیدائشی طور پر سردی گرمی سے محفوظ رہنے کے لئے بال و پر یا مضبوط کھال رکھتا ہے اور خوراک پیدا کرنے کے لئے پنجے اور دانت وغیرہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور انفرادی طور پر جانور اپنی خوراک اور اس کے نفع و نقصان سے آگاہ ہیں۔ اس کے برعکس انسان پیدائشی طور پر ان لوازمات سے عاری اور دوسروں کے تعاون و تربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ اس تعاون و تعلیم کے بغیر اپنے مصالح تک رسائی سے قاصر ہوتا ہے۔ ان پیدائشی نقائص کے عوض قدرت نے انسان کو عقل و فکر دی ہے جو تعاون و تعلیم کے سلسلے میں انسان کی رہنمائی کرتی اور اس کی صلاحیت کو بڑھاتی ہے۔

چونکہ انسانی معاشرے کی بقاء و ترقی کے لئے افراد کا باہمی تعاون اور معاشرے کا قیام ضروری ہے۔ اس لئے ابن مسکویہ زہد یا ترک دنیا کو دل کے منافی قرار دیتا ہے بلکہ اسے ظلم و جبر سے تعبیر کرتا ہے، کیونکہ زاہد یا تارک دنیا محنت و اکتساب سے محروم ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے ابنائے جنس کے لئے کسی فائدے کا باعث ہونے کے بجائے ایک نقصان دہ بوجھ بن جاتا ہے، یعنی تارک دنیا دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اپنا پیٹ تو بھرے گا لیکن اس امداد و معاونت کے بدلے اپنے ابنائے جنس کو کوئی فائدہ پہنچانے سے قاصر ہو گا جو عدل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے ابنائے جنس کے لئے ہر فرد دست تعاون بڑھائے، یعنی ان سے لے بھی اور انہیں دے بھی۔ قلیل کے مقابلے

میں قلیل اور کثیر کے مقابلے میں کثیر۔ابن مسکویہ کے ہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اس تعاون کی قلت و کثرت سے مراد کمیت نہیں بلکہ کیفیت ہے یعنی ایک ماہر انجینئر تھوڑی سی توجہ سے وہ کام انجام دے لے گا جو ایک عام آدمی کئی دنوں کی مشقت کے باوجود بھی انجام دینے سے قاصر ہو گا۔

3. علی الحسین بن عبداللہ بن الحسن بن علی بن سینا (980ءتا1037ء) نے اپنی غیر فانی کتاب "الشفاء" کے دسویں مقالے کی آخری چند فصول میں سیاست مدن کے علاوہ عمرانیات یا علم الاجتماع کے اصول بیان کئے ہیں۔ابن سینا کے نزدیک انسانی معاشرے کی تعبیر اور سیاست مدن کی تنظیم کے لئے نبوی والہام کی ضرورت ہے اس لئے نبی کا مبعوث ہونا ضروری ہے۔اس کے بغیر نہ تو کوئی معاشرہ ترتیب پا سکتا ہے ورنہ ہی سیدھی راہ پر گامزن ہو کر ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ابن سینا کو قدماء فلاسفہ کے اس قول سے اتفاق ہے کہ اجتماعی زندگی گزارنا انسان کی فطرت مجبور ہے کوئی فرد بشر انفرادی طور پر اچھی اور پر سکون زندگی گزارنے کے قابل نہیں۔زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے مشارکت و تعاون لازمی ہے۔جس کا نتیجہ باہمی لین دین کے معاملات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے معاملات کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے لئے قانون و عدل کے اصول متعین ہوں یہ اصول وضع کرنے کے لئے ایک مقنن اور منصف درکار ہے جو ان اصولوں کو عملی نفاذ کا بھی ذمہ دار ہو گا اور وہ لازماً انسان ہی ہو گا یہیں سے نبی کا معبوث ہونا لازم آتا ہے۔جو انسانوں ہی میں سے ہونا چاہیے۔

کتاب الشفاء کی ایک فصل تدبیر منزل اور تدبیر سلطنت کے لئے مختص ہے۔یہ فصل اس لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے کہ اس میں ان تمام باتوں پر بحث موجود ہے جن پر آج عمرانیات کے ماہرین زور دیتے ہیں، جیسے معاشرے کی ترقی میں صنعت و حرفت کی اہمیت، بیکاری اور بے روزگاری کے مسائل اور معاشرے میں عورت کا مقام و حقوق وغیرہ۔ابن سینا کے نزدیک، بیکار اور بے روزگاری کو ممنوع اور حرام ہونا چاہیے اور کوئی فرد بھی کام کے بغیر دوسروں کے سہارے زندگی بسر نہ کرے۔حکومت وقت کو اس قسم کے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے اور اگر سست لوگ باز نہ آئیں تو انہیں جلاوطن کر دیا جائے لیکن اگر بیکار یا دوسروں کے سہارے جینے کا سبب کوئی مرض یا آفت ہو تو اس صورت میں معاشرے کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے ایک پناہ گاہ کا انتظام کیا جائے جہاں انہیں معاش مہیا ہو سکے۔

ابن سینا، افلاطون کے اس نظریہ عمرانیات کو مسترد کرتا ہے جو شیوعیت و اشتراکیت کا قائل ہے اور جس کے مطابق شرکت فی المال کے علاوہ شرکت فی النساء کی بھی گنجائش ہے۔وہ قدیم فلاسفہ کے اس نظریئے کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ

کام کاج سے بالکل معذور لوگوں کو قتل کر کے سرے سے بوجھ اتار دینا چاہیے۔ اس کے بجائے وہ اسلامی شریعت کے احکام کے مطابق ایسے معذور لوگوں کی معاشرتی کفالت کی ذمہ داری ورثاء پر ڈالتا ہے۔ ابن سینا کے نزدیک افراد معاشرہ ایسے پیشے اختیار کرے بھی آزادی نہیں جو افراد معاشرے کے لئے ضرر کا باعث ہوں، جیسے قمار بازی اور عصمت فروشی وغیرہ۔

4. ابوزید عبدالرحمن بن محمد بن محمد بن خلدون ولی الدین التونسی الحضرمی الاشبیلی المالکی (متوفی (808ھ) کو عمرانیات کا بلا شرکت غیرے امام و موجد کہا جا سکتا ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ واقعات و حوادث کی تفاصیل کی روشنی میں انسانی معاشرے کی ارتقائی داستان بیان ہو لیکن اس کے نزدیک تاریخ کے واقعات و حوادث خود بخود یا اتفاقاً پیش آنے والے نہیں بلکہ ان کے کچھ اسباب و قوانین ہیں جو انسانی معاشرے کو تحریک دیتے رہے ہیں ان اسباب و قوانین کے مطالبے سے جو علم تعلق رکھتا ہے اسے وہ "علم العمران" کا نام دیتے ہیں۔

ابن خلدون عمرانیات کے ظواہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جو اجتماع یا عمران سے باہر ہیں، جیسے دینی عقائد، آب و ہوا اور ماحول، دوسرے وہ جو اجتماع یا عمران کے اندر شامل ہیں، خود معاشرے کی گود میں پیدا ہوتے ہیں اور پوری قوت سے معاشرے پر اثر انداز بھی ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی معاشرے کے ان داخلی عوامل کو ابن خلدون انسانی معاشرے پر طاری ہونے والے تین اطوار کے قانون سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر انسانی معاشرہ تین مراحل سے گزرتا ہے: ابتداء میں صحرا و بادیہ میں خانہ بدوشی کی زندگی ہوتی ہے اور لوگ قبائل کی شکل میں رہتے ہیں اور وہاں صرف عادات و رسوم اور وقتی ضروریات ہی قانون ہوتی ہیں۔ دوسرے مرحلے میں مختلف قبائل منظم و متحد ہو کر ریاست یا سلطنت کی بنیاد رکھتے ہیں اور فتوحات اور تنظیم سلطنت کے ساتھ قوانین اور آداب زندگی مرتب ہوتے ہیں، تیسرے مرحلے میں قوم جب شہری زندگی اور تمدن کے آداب میں رچ بس جاتی ہے تو علوم و فنون میں منہمک ہونے کے علاوہ خوشحالی و تن آسانی پھر لہو و لعب اور بالآخر اضمحلال و زوال کا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔

تاریخ کے واقعات و حوادث سے اصول معاشرت اور تہذیب کا استنباط کرنے میں ابن خلدون، میکاولی (Machiavelli) اور مونٹسکو (Montesquieu) سے قریب مماثلت رکھتا ہے اور دیگر مسلم فلاسفہ اور مفکرین کی اکثریت کے برعکس وہ سلطنتوں کے قیام کو نبوت کا مرہون منت قرار نہیں دیتا۔ تاہم اس کی رائے یہ ہے

کہ عرب صرف دینی عقیدے کی بنیاد ہی پر سلطنت قائم کر سکیں گے۔

ابن خلدون کے نزدیک انسانی معاشرے میں اثرانداز ہونے والے عوامل اجتماع یا معاشرے کے خارجی عوامل کہلاتے ہیں جو تین ہیں ان میں سب سے پہلا عامل اقلیم ہے۔اس سے ابن خلدون کی مراد کسی خطے یا علاقے کا طبعی ماحول اور آب و ہوا ہے۔ وہ اس کرہ ارض کو سات اقالیم یا علاقوں میں تقسیم کرتا ہے جن میں انسانی معاشرے کے ارتقاء اور پھیلانے پھولنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں خطہ معتدلہ ہے جو شام و عراق اور ان سے متصل ممالک پر مشتمل ہے۔ انتہائی گرم یا انتہائی رسد خطے ،انسانی معاشرے کے پنپنے کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں اور نقصان دہ ہیں دوسرے عالم کو وہ جغرافیائی خاصیت کا نام دیتا ہے۔ جس کے مطابق زمین کی زرخیزی اور خوراک کی نوعیت انسانی معاشرے کے افراد کی نشو و نما اور جسمانی صلاحیتوں پر اثرانداز ہوتی ہے۔ تیسرا عامل دین و مذہب کا عنصر ہے۔ جسے ابن خلدون ایک طاقتور عامل قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وحی الہام سے ہدایت یافتہ انسانی معاشرہ بت پرستی اور بے دین معاشرے سے ممتاز اور نمایاں ہے۔

ابن خلدون انسانی معاشرے کو ایک فرد کی زندگی سے تشبیہ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ جس طرح ایک فرد زمانہ طفولیت، شباب اور بڑھاپے کے مراحل سے گزرتا اور ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ایک انسانی معاشرہ یا ایک قوم بھی تین مراحل سے گزرنے کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ابن خلدون کے نزدیک کسی طاقتور قوم یا معاشرے کے زوال کے اسباب تین ہو سکتے ہیں۔

1. قوم کے شرفاء کمزور ہو جاتے ہیں اور معاشرے کی باگ ڈور رذیل لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔
2. تنخواہ دار سپاہی جب تشدد کی راہ پر پڑ جاتے ہیں اور ظلم و فساد پھیلانے لگتے ہیں۔
3. حد سے زیادہ خوشحالی، جو اقوام کو تن آسان بنا دیتی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی مسلمان ماہرین عمرانیات میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا تیسرا مبحث مسائل عمرانیات وسیاسیات کے لئے مختص ہے جسے انہوں نے "مبحث الارتفقات" کا عنوان دیا ہے۔
شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ انسان حصول رزق اور تولید نسل وغیرہ خصائص میں تو دیگر حیوانات کے ساتھ شریک ہے، مگر وہ تین اشیاء میں ان سے ممتاز ہے:

1. انسان ایک دوررس اور نکتہ بین عقل کا مالک ہے اور ہر مسئلے اور ہر شے کی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ دیگر حیوانات میں یہ صلاحیت موجود نہیں، مثلاً جانور صرف بھوک مٹانے کے لیے روز تلاش کر کے بات ختم کر دے گا۔ مگر انسان کے سامنے محض بھوک مٹانا نہیں بلکہ اس کے سامنے اور بھی بے شمار اعلیٰ وارفع مقاصد ہوں گے۔
2. انسان میں تدبیرات کے ساتھ ساتھ نزاکت و حسن نظر بھی پایا جاتا ہے۔ جانور تو فقط ضرورت پوری کرے گا مگر انسان اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے علاوہ حسن اور لذت مزید کا بھی خواہاں ہو گا۔
3. انسانوں میں ایسے صاحب عقل و کمال لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جو نئے نئے نتائج پیدا کرنے کی انوکھی راہیں نکالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جو لوگ یہ نتائج اخذ کرنے اور استنباط کرنے پر قادر نہیں ہوتے وہ اپنے اہل عقل و درایت کے اخذ کردہ نتائج پر عمل پیرا ہوتے ہیں جس سے انسانی معاشرہ ترقی و تعمیر کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک کوئی انسانی معاشرہ ارتفاقات یا اجتماعی تدبیرات نافعہ سے خالی نہیں ہو سکتا، حتی کہ جنگل یا پہاڑ کی چوٹی پر بود و باش رکھنے والا انسانی گروہ بھی اس سے خالی نہیں ہو سکتا اسی لئے وہ ارتفاقات کی دو حدیں مقرر کرتے ہیں اعلی اور ادنی۔ ادنی حد یہ ہے کہ ناقص معاشرہ بھی بنیادی تدبیرات نافعہ سے محروم نہ ہو گا۔ اس ادنی حد کو وہ ارتفاق اول کا نام دیتے ہیں۔

ارتفاقات کی اعلی حد وہ ہے جس سے پر رونق شہروں اور قصبات کے لوگ متمتع ہوتے ہیں۔ اسے وہ ارتفاق ثانی کا نام دیتے ہیں۔ ارتفاق ثالث کا تعلق قیام ملک سے ہے اور ارفاق رابع سے ان کی مراد خلافت کا قیام ہے۔ گویا خلیفہ کا اقتدار تمام بادشاہوں پر حاوی ہو گا۔

شاہ ولی اللہ، ابن سینا کی طرح معاشرے میں مضرت رساں ذرائع معاش اور معاملات میں پاکیزگی اور مودت و رحمت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر 1: علم عمرانیات کی تعریف میں مسلم اور غیر مسلم مفکرین کی آراء کا موازنہ کیجیے۔

سوال نمبر 2: ابن سینا کے بیان کردہ عمرانیات کے اصولوں پر مفصل بحث کیجیے۔

سوال نمبر 3: ابن خلدون کو علم عمرانیات کا موجد اور امام کیوں کہا جاتا ہے؟ اس فن کی تدوین وارتقاء میں اس کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

یونٹ نمبر 8

علم تاریخ و طبقات نگاری

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 139
یونٹ کے مقاصد 140
1-تاریخ نویسی 141
1.1-علم تاریخ کی ابتداء.....141
1.2-اسلام میں تاریخ نگاری.....142
2-طبقات نگاری 146
2.1-تاریخ اور طبقات کا باہمی تعلق.....146
2.2-طبقات نگاری کے مناہج.....147
2.3-طبقات نگاری پر اہم تالیفات.....148

یونٹ کا تعارف

''اسلامی معاشرے کی داخلی ضروریات نے جن علوم کو ایجاد کیا ان میں علم تاریخ بھی ہے، اسلام میں رسول اللہ ﷺ کے قول عمل اور صحابہؓ کے آثار کو جو مثالی حیثیت اور قانونی اہمیت حاصل ہے اس کی کسی دوسرے دین اور معاشرے میں نظیر نہیں ملتی۔ حال کے لئے ماضی کی اہمیت مسلمہ ہے۔ شریعت اور معاشرے کے تسلسل اور ارتقاء کو جو نقش اوّل مسلمانوں کے دلوں پر بیٹھا اس نے انہیں فوری طور پر حوادث وواقعات، سیر وسوانح اور اقوال وآثار کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کو شعور دلایا۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ ماضی کے علم کا ذریعہ ''خبر'' ہے اور خبر کا وقار ''طریق روایت'' سے متعین ہوتا ہے۔ اس طرح کہ ایک عینی شاہد واقعہ کی خبر دے اور وہ خبر جانے بوجھے ثقہ راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچے۔ الغرض مسلمانوں نے اپنی مخصوص دینی ثقافت، قومی مزاج اور فطری عقل وذہانت کے مجموعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے واقعات کو اسناد کے ساتھ جمع کرنا شروع کیا۔ یہ طریقہ اسلام سے پہلے نہ تو عربوں میں رائج تھا اور نہ ہی پڑوس کی دیگر اقوام میں۔ اسلامی ادبیات کی اقسام میں طبقات ایک ایسی نوع ہے جو نہ صرف بے شمار شخصیات کے تراجم پر مشتمل ہوتی ہے بلکہ ان تراجم کے ضمن میں گرانقدر معاشرتی، سیاسی اور تمدنی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ کتب طبقات وتراجم میں متعدد ایسے حقائق سامنے آجاتے ہیں جو تاریخی اور تقویمی ادب میں نہیں ملتے۔ ان شخصیات نے جو علمی وادبی کارنامے سرانجام دیئے ہیں، ان کی صحیح قدر وقیمت جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انہیں ان شخصیات کے ذاتی اور معاشرتی تناظر میں دیکھا جائے۔ اس یونٹ میں آپ مسلمانوں کی تاریخ نگاری اور طبقات نگاری کی تاریخ کے علاوہ ان کے ارتقاء کے مناہج کا مطالعہ کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. اسلام کی تاریخ نگاری کے آغاز وارتقاء پر بحث کر سکیں۔
2. مسلمانوں کی تاریخ نگاری کی خصوصیات کا جائزہ لے سکیں۔
3. علم تاریخ میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں پر تبصرہ کر سکیں۔
4. تاریخ اور طبقات نگاری کے باہمی تعلق کو واضح کر سکیں۔
5. طبقات نگاری کے آغاز وارتقاء اور اس کی اہم تالیفات کے متعلق بیان کر سکیں۔

1-تاریخ نویسی

1.1-علم تاریخ کی ابتداء

انسانی دنیا کے ابتدائی ادوار میں تاریخی واقعات کو محفوظ رکھنے اور ان کی جمع تدوین کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اسلام کے واقعات آئندہ آنے والی نسل کو منتقل تو ہوتے رہے مگر ان کو باقی رکھنے کا کوئی باقاعدہ اہتمام نہ تھا۔ چنانچہ تاریخی واقعات طرح طرح کے اختلافات و تغیرات کی بدولت کچھ سے کچھ ہوتے گئے اور بہت سے فراموش کیے جانے لگے۔ یہ صورت حال صدیوں تک چلتی رہی، تاآنکہ حروف و کتابت کی ایجاد ہوئی اور خال خال انسانوں نے پتھروں اور تانبے کی تختیوں پر تحریر کی ابتداء کی۔

اپنے زمانے کی بعض متمدن اقوام جیسے فارس، روم، ہند و چین میں تاریخی احوال لکھنے کا تھوڑا بہت رواج رہا۔ مورخین اسلام نے ان قوموں کے جمع کردہ بہت سے احوال نقل کئے البتہ ان ذرائع سے انبیاء و سلاطین اور علماء و حکماء وغیرہ کے جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان کی صحت کا ہم یقین نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ سوائے ان واقعات واحوال کے جو تواتر کے ساتھ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے۔

یہ واقعات واحوال ناقابل اطمینان و یقین اس لئے ہیں کہ ان تواریخ کے مولفین نے اس سند کا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں رکھا، جس سے صحت و سقم کے پرکھنے کا موقع ملتا ہے اور نہ ایسا ہوا کہ ان مولفین سے ان کے بعد والوں تک جو کچھ پہنچا ہے اس کے لئے متصل سند تو کجا، کوئی منقطع سند ہی ہوتی۔

پھر نہ ان مولفین کی عداوت کا کوئی علم ہے اور نہ ان کے کچھ ایسے حالات معلوم ہیں جن سے فی الجملہ یہ اطمینان ہو سکتا ہو کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں جو کچھ جمع کیا ہے وہ صحیح ہے اسی لئے ہم کتب سابقہ کی تصدیق نہیں کر سکتے اور نہ ان لوگوں کی منقولات کی تصدیق کر سکتے ہیں جنہوں نے کتب سابقہ کے جامعین کے بعد ہمارے زمانے تک معلومات دیں، اور نہ ہم ان لوگوں کے اس سرمایہ کی تکذیب کرتے ہیں جو ہمارے سامنے مقدمات کی قبیل سے ہے کہ جب تک اس کی صدق یا کذب پر کوئی واضح دلیل قائم نہ ہو، اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

قدیم مغربی تاریخ بلکہ ماضی قریب تک کی مغربی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہونے کا اعتراف خود ان مغربی مورخین کے متعدد متاخر مولفین نے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افراد قدیم تاریخ کی چھان بین میں منہمک ہیں اور یہ تاریخ اپنے اندر جو جھوٹے قصے اور بے سر و پا حکایتیں رکھتی ہے ان کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کیا جا رہا ہے اپنی کوششوں میں یہ کہاں تک اور کیسے کامیاب ہو سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ محض دو چار امور کی تحقیق کر کے ان کی صحت کا اطمینان کر لیں یا پھر ان چند آثار قدیمہ سے کی اشک شوئی ہو جائے جو ظاہر ہوئے ہیں اور جن سے بعض باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جو تاریخ میں مذکور ہیں۔

یہ پوری طرح اپنے مقصد میں اسی لئے کامیاب نہیں ہو سکتے جیسا کہ ہم اس کی طرف ابھی اشارہ کر آئے ہیں کہ حضرات سند سے محروم ہیں اور ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے ان کتب تاریخ کے مولفین کی عدالت ان کے حفظ و ضبط اور ان کی فہم و فراست معلوم کر سکیں اور پھر وہ اطمینان و اتحاد پیدا ہو جس کی بنا پر انسان یقین و تصدیق کی طرف مائل ہوتا ہے۔

البتہ اسلامی تاریخ میں یہ شرح ملحوظ رہی ہے اور مورخین اسلام نے یہ روش اختیار کی ہے کہ اسی لئے یہ حضرات اس میزان کے ذریعے جو علماء حدیث کے یہاں "علم المصطلح "اور"علم اصول الحدیث" سے موسوم ہے، صحت و سقم اور صدق و کذب کی معرفت پر اور تاریخی بیان میں بعض لوگوں کو عارض ہونے والے اوہام کی نشاندہی پر قادر ہوئے۔

1.2-اسلام میں تاریخ نگاری

اسلام کے ابتدائی دور میں صحابۂ کرام، آنحضرت ﷺ کے واقعات اور مغازی و سیر کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے اور اپنی اولاد کو بھی انہیں یاد کرنے کی تاکید کرتے رہتے۔

مسلمانوں کے ہاں تاریخ نگاری کا باقاعدہ آغاز عہد بنو امیہ (41-132ھ/661-750ء) میں ہوا سب سے پہلے عبید بن شبرمہ الجرہمی (المتوفی 687ء) نے حضرت معاویہ کے لئے"کتاب الملوک و اخبار المارضین" کے نام سے ایک کتاب لکھی، یہ تاریخ کی پہلی کتاب ہے۔ فتوحات کے موضوع پر قلم اٹھانے والوں میں ابوالقاسم عبد الرحمان بن عبد اللہ بن عبد الحکم (المتوفی 257ھ) مشہور ہوئے۔ ان کی تصنیف "فنوح مصرو و

اخبارہ" مصر، شمالی افریقہ اور سپین کی فتوحات کا اولین ماخذ مانی جاتی ہے۔ اسی زمانے میں ابوالحسن احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد البلاذری (پیدائش: 806ء—وفات: 892ء) نے "فتوح البلدان" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں مختلف علاقوں کے فتح ہونے کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد تاریخ نگاری کا زریں عہد شروع ہوا اور کثرت سے کتابیں تحریر کی گئیں۔

تاریخ کے موضوع پر مسلم مؤرخوں کی لکھی ہوئی کتابوں کا شمار کرنا بے حد دشوار ہے۔ اگر صرف مورخ اور اس کی تصنیف کے نام پر اکتفا کیا جائے تب بھی کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ کثرت تصنیف کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حافظ علاءالدین مغلطائی (المتوفی 762ھ/1369ء) نے آٹھویں صدی ہجری میں ایک شخص کے پاس تاریخ کے موضوع پر ایک ہزار کتابیں دیکھی ہیں۔ ان کے بعد حاجی خلیفہ (1017-1067ھ) نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "کشف الظنون" میں تاریخ کے موضوع پر تیرہ سو کتابوں کا ذکر کیا۔ ان کتابوں میں بعض اتنی ضخیم ہیں کہ ایک ایک کا جائزہ لینے کے لئے عمر نوح درکار ہے۔ ایک تصنیف "تاریخ دمشق" اسی (80) جلدوں پر مشتمل ہے۔ تصنیف میں تنوع کے لحاظ سے بھی ان کا احاطہ مشکل ہے۔

مفسرین، محدثین، مورخین، متکلمین، فقہاء، صوفیائ، حکماء، وزراء، اطباء، شعراء کی تاریخیں الگ الگ ہیں۔ ممالک بلاد وامصار اور صوبوں کی تاریخیں جدا جدا تحریک کی گئی ہیں۔ فقہ، کلام اور تصوف کے مختلف مکاتب فکر اور سلاسل کی تاریخیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ زمانی اور مکانی ترتیب سے الگ الگ کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ صرف عربی میں نہیں بلکہ فارسی، ترکی اور اردو وغیرہ میں بھی مسلمانوں نے تاریخ کے موضوع پر اتنی کتابیں تصنیف کی ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں تحقیقی معیار کے لحاظ سے بے مثال ہیں۔ جغرافیائی، سماجی اور تاریخی معلومات کی چھان بین میں ہر ممکن احتیاط برتی گئی ہے۔ مسلم مورخوں کی ان کوششوں سے عہد وسطی کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت محفوظ ہو گئی ہے جس کا اعتراف غیر مسلمانوں نے بھی کیا ہے۔ نامور فاضل ول ڈرونٹ (Will Dornt) لکھتے ہیں:

> "مسلم علماء میں سے ہم مورخین کو سب سے زیادہ یاد کرتے ہیں کیونکہ ایک تہذیب کے متعلق ہمارے پاس جو علم ہے وہ انہی کی بدولت ہے، ان کے بغیر یہ تہذیب ہمارے لئے اتنی ہی نامعلوم ہوتی جتنا چپولون سے پہلے کا فرعونی مصر ہے۔"

دوسری قوموں کے مورخوں کے برعکس مسلم مورخوں نے اپنی کتابوں میں معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ

فراہم کر دیا ہے ابن اسحاق، ابن ہشام، ابن قتیبہ الدینوری ، ابن جریر الطبری اور مسعودی کی شاندار خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ول ڈورنٹ کہتے ہیں:

"اپنے عظیم کام کی وسعت اور دلچسپیوں کے پیش نظر مورخ حتی المقدور آگے ہیں۔ یہ جغرافیہ اور تاریخ کو مناسب انداز میں جمع کرتے ہیں۔ اور انسان سے متعلق کوئی بھی چیز ان کے لئے اجنبی نہیں ہوتی۔ یہ مسیحی دنیا کے معاصر مورخوں سے حد درجہ فائق ہیں"۔

مسلمانوں نے علم حدیث اور اسماء الرجال کے زیر اثر غیر جانبداری اور حد درجہ احتیاط کے ساتھ تاریخ نگاری کا فرض انجام دیا۔ ان کے ہاں تاریخ نویسی میں واقعات کے تحلیلی و تنقیدی جائزے کا عنصر کسی نہ کسی حد تک ہمیشہ موجود رہا ہے۔ نامور مسلم مورخوں میں طبری مسعودی اور ابن مسکویہ نے تعصبات سے بالاتر ہو کر حقیقت بیانی کا جو مظاہرہ کیا ہے، وہ دوسروں کی نظروں میں بھی قابل تحسین قرار پایا فلپ کے حتی (Philip K.Hitti) نے طبری اور مسعودی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی تصنیفات سے عربوں کی تاریخ نگاری نقطہ عروج کو پہنچ گئی اور ابن مسکویہ کے بعد اس کا معیار سرعت سے نیچے گرا۔

دور انحطاط کی مسلم تاریخ نویسی کا معیار بھی دوسری قوموں کی تاریخ نگاری سے بہتر رہا بلکہ یہ جدید زمانے کی تاریخ نویسی سے بھی کہیں کہیں بہتر نظر آتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹنیکا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"بارہویں اور ابتدائی تیرھویں صدی کی شامی اور عراقی تاریخ نگاری کم از کم اتنی ہی قابل قدر ہے جتنی اس زمانے کی مغربی تاریخی تصنیفات بلکہ کہیں کہیں تو یہ صاف طور پر زیادہ اچھی ہے"۔

مسلم تاریخ نگاری کی ایک عبقری شخصیت ابن خلدون کی ہے جنہوں نے تاریخ پر" كتاب العبر، وديوان المبتدأ والخبر في أيام العرب والعجم والبربر، ومن عاصرهم من ذوي السلطان الأكبر "کے عنوان سے کتاب تحریر کی ہے۔ تاریخ کے پہلے حصے کے طور پر انہوں نے جو مقدمہ تحریر کیا ہے وہ عالمی تاریخ میں ایک گراں قدر اور بے مثال اضافہ ہے۔ ابن خلدون نے اس مقدمہ میں فلسفہ تاریخ کے اصول و آداب، قوموں کے کردار پر جغرافیائی اور سماجی عوام کے اثرات اور اسباب و علل کی روشنی میں سلطنتوں کے عروج و زوال کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ فلپ کے حتی نے انہیں تاریخ کی حقیقی اہمت اور ماہیت کا موجد اور فن سماجیت کا اصلی بانی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"کسی عرب مصنف نے اور نہ ہی کسی یورپ مصنف نے بھی دفعتاً کبھی تاریخ کا جائزہ اس قدر قابل فہم اور مفکرانہ انداز میں کیا تھا۔ نقادوں کا اتفاق ہے کہ ابن خلدون اسلام کے عظیم ترین تاریخی مفکر اور تاریخ کے عظیم ترین مفکرین میں سے ایک ہیں"۔

تاریخ نگاری میں ان علماء نے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں جنہوں نے مشاہیر کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ یاقوت حموی (575- 626ھ) کی "معجم الادباء" ابن عساکر (المتوفی 571ھ) کی "تاریخ دمشق" ابن خلکان (المتوفی 681ھ) کی "وفیات الاعیان" کی طرح سینکڑوں کتابیں ہیں جن میں مشاہیر اسلام کے مکمل احوال و کوائف جمع کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں بھی مسلم مورخوں نے ان اصولوں کا لحاظ رکھا ہے جو حقیقت نگاری کا حصہ ہیں۔ ان میں ابن خلکان کی تصنیف "وفیات الاعیان" سوانحی تاریخ کا شاہکار ہے۔ مصنف نے اس ضخیم کتاب میں آٹھ سو پینسٹھ (865) مشاہیر کی تاریخ لکھی ہے۔ مستشرقین نے بھی اس شاہکار تصنیف کی داد دیتے ہوئے اسے "تاریخ کی بہترین عمومی سوانحی تاریخ" قرار دیا ہے۔ امام ابن حزم (384-456ھ) نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرکے " الفصل فی الملل و الا ھواء و النحل" تحریر کرکے دنیا کے مشہور مذاہب پر بے لاگ تبصرے کئے۔ ان کے بعد محمد بن عبدالکریم شہرستانی (469-548ھ) نے اسی موضوع پر " کتاب الملل والنحل" تصنیف کی جس میں انہوں نے مختلف مذاہب اور فرقوں کی تاریخ اور عقائد و خیالات کا وسیع ذخیرہ جمع کیا۔ ول ڈورنٹ ان کی کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محمد شہرستانی نے کتاب الملل والنحل میں دنیا کے بڑے مذاہب اور مکاتب فکر کا تجزیہ کیا اور اس انداز سے ان کی تاریخ کا خلاصہ بیان کیا کہ کوئی معاصر ایسی علمی اور غیر جانبدارانہ کتاب نہیں لکھ سکتا تھا"۔

خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1: ابتدائی دور کی تاریخ پردہ خفاء میں کیوں ہے؟ وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر 2: تاریخ نویسی میں مسلم مؤرخین کے کارہائے نمایاں بیان کیجیے۔

سوال نمبر 3: ابن خلدون کی کتاب کی نمایاں خصوصیات قلم بند کیجیے۔

2-طبقات نگاری

تاریخ کی اقسام میں سے ایک قسم طبقات نگاری ہے، طبقات، طبقہ کی جمع ہے۔ یہ لفظ اسم مکان اور اسم زمان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اسم مکان کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی ہیں : ایک جیسے، ایک دوسرے کے اوپر واقع۔ اور اگر یہ لفظ اسم زمان کے طور پر استعمال ہو تو اس کے معنی نسل اور قرن کے ہیں۔ کتابوں کے ناموں، مثلاً طبقات الشعراء سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شاعروں کا نسلاً بعد نسل ذکر ہے ایک ہی زمانے سے متعلق لوگوں بالعموم ایک ہی طبقے میں شامل ہوتے ہیں۔

2.1-تاریخ اور طبقات کا باہمی تعلق

تاریخ میں وقت بتا کر احوال و واقعات کو متعین کیا جاتا ہے اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے۔ ابتداء آفرینش کی حکایات انبیاء کے واقعات، گزشتہ اقوم کی سر گزشت، مختلف اہم واقعات و حوادث مصائب و آفات امور سلطنت کے تذکرے خلفاء و وزراء کے حالات، جنگیں اور ملک و حکومت کے ایک دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے واقعات، رفاہ عامہ کے کام نیز رواۃ آئمہ کے حالات زندگی، ان کی ولادت و وفات، صحت و عقل، حفظ و ضبط اور طلب علم کے سفر وغیرہ ان تمام امور کا تعلق تاریخ سے ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس فن میں سارے زمانے کے واقعات سے بحث کی جاتی ہے، ان کی تحدید اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں کب، کیا اور کیسے ہوا، تاریخ کا موضوع انسان اور زمان یعنی زمانے کی نسبت سے انسان کے احوال کی معرفت ہے۔

طبقات اور تاریخ کی تعریفوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ طبقات الرجال تاریخ کی انواع میں سے ایک اہم قسم ہے۔ ان کے باہمی ربط و تعلق کے بارے میں علامہ سخاوی، عزبن جماعۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''علم تاریخ اور علم طبقات کے درمیان اور ان دونوں کے موضوع اور غایت کے درمیان فرق کا جاننا مشکل لیکن نہایت ضروری ہے اور میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ بحسب الذات دونوں ایک ہی چیز ہیں اور بحسب الاعتبار دونوں میں فرق ہے۔''

علامہ سخاوی فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک دونوں میں عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ راویوں کا حال بیان کرنے کے حد تک دونوں ایک ہیں، اس کے بعد تاریخ صرف واقعات کو لیتی ہے اور علم طبقات میں کسی شخص کا طبقہ متعین کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شرکاء بدر میں سے کسی شخص کی وفات اس شخص کے بعد ہوئی جو بدر میں شریک نہ تھا تو اگرچہ وہ وفات کے لحاظ سے متاخر ہے لیکن طبقہ کے لحاظ سے مقدم ہے''۔

2.2-طبقات نگاری کے مناہج

مسلمان مورخین نے طبقات نگاری میں بالعموم چار اسالیب اختیار کئے ہیں۔

1. پہلا انداز جو طبقات نگاری کا حقیقی انداز ہے اور طبقات کے لغوی مفہوم سے مطابقت رکھتا ہے، یہ تھا کہ نسلوں کے اعتبار سے طبقات کی تعیین کی جائے۔ چنانچہ طبقات ابن سعد میں یہی اسلوب پیش نظر رکھا گیا ہے۔
2. لیکن نسلوں کے اعتبار سے طبقات میں ترتیب عملاً دشوار تھی اور جلدی سے کسی شخص کے حالات تلاش کرنے میں دقت پیش آتی تھی لہذا اس ترتیب کو باقاعدہ بنانے کے لئے یکساں طوالت کے زمانوں کو یکجا کر دیا گیا اور ہر زمانے کے اندر ایک ترتیب اختیار کی گئی جو عموماً حروف ہجاء کے مطابق ہوتی۔ بعض تالیفات میں صدیوں کا حساب رکھا گیا جیسا کہ ابو عبید الرحمن محمد بن حسین السلمی (412ھ) کی "طبقات الصوفیہ "اور بعض تالیفات میں صدیوں کے بجائے بیس بیس سال کی مدت لی گئی ہے۔ جیسے تاج الدین عبدالوهاب بن تقي الدين السبكي (المتوفى: 771ھ) کی "طبقات الشافعية الكبرى" ہیں۔
3. بعض تالیفات میں طبقات کا تعین وفیات سے کیا گیا ہے اور اس وجہ سے بسا اوقات یہ ہوتا رہا ہے کہ ایک شخص ایک طبقہ میں شامل دوسرے لوگوں کے درجہ کا نہیں ہے لیکن اس کی وفات اس طبقہ کے لوگوں میں ہو گئی ہے اس لئے وہ اس طبقہ میں شامل سمجھا جاتا ہے۔
4. مذکورہ بالا تینوں اسالیب کی کتاب طبقات سے استفادہ میں دقت پیش آتی تھی چنانچہ اس سے بچنے کے لیے طبقاتی کتب کو معجم کی ترتیب پر مدون کیا جانے لگا۔ اس انداز کی قدیم ترین تصنیف غالباً ابو عمرو عثمان بن سعید بن عثمان بن سعید بن عمر اموی دانی کی "طبقات القراء" ہے۔

2.3-طبقات نگاری پر اہم تالیفات

طبقات پر پہلی کتاب واصل بن عطاء مخزومی (80-131ھ) نے لکھی جس کا نام "طبقات اهل العلم و الجهل" رکھا۔اس کے بعد مسلمانوں نے مختلف ادوار میں اس فن پر اتنی کتابیں لکھیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ذہبی نے تاریخ کو چالیس اصناف میں تقسیم کیا ہے۔الخساوی نے ان اصناف کی فہرست دینے کے بعد ان میں سے ستائیس اصناف پر لکھی گئی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے تاہم ان میں سے تقریباً دس اصناف ایسی ہیں جنہیں بطور خاص قرون وسطی کے مسلم مورخین نے طبقاتی ادب کا موضوع بنایا ہے۔ذیل میں ان اصناف کے حوالے سے اہم تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے جہاں یہ اندازہ ہو گا کہ تاریخ کی یہ اہم شاخ کسی قدر مسلم مورخین کی توجہ کا مرکز رہی وہاں طبقاتی ادب کے ارتقاء کا خاکہ بھی سامنے آئے گا۔

1. طبقات المحدثین والرواۃ

محدثین اور حدیث کے راویوں کے حالات پر واقدی نے "الطبقات الکبری" خلیفہ بن خیاط بن خلیفہ الشیبانی نے "کتاب الطبقات" امام مسلم نے "طبقات التابعین" ابو بکر احمد بن ہارون نے "کتاب الطبقات فی الاسماء المفرد" حسین بن محمد بن مودود الحرانی نے "کتاب الطبقات" ابو نعیم احمد بن عبداللہ الاصبھانی نے "طبقات المحدثین و الرواۃ" حافظ ذہبی نے "طبقات الحفاظ" اور جلال الدین سیوطی نے "طبقات الحفاظ" کے عنوان سے کتب تصنیف کیں۔

طبقات فقہاء پر دو زاویوں سے کتب تالیف کی گئیں۔کچھ کتابیں عام فقہاء سے متعلق ہیں خواہ وہ کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں جب کہ دوسری قسم ایک متعین فقہی مسلک کے فقہاء کے طبقات سے ہے۔طبقات الفقہاء پر ابو عبدالرحمن الھیثم نے "طبقات الفقہاء" ابو حفص عمر بن علی المطوعی الادیب نے "طبقات الشافعیہ" اور تاج الدین السبکی نے "طبقات الشافعیہ" قاضی قطب الدین نے "اللمع الالمعیۃ الاعیان الشافعیۃ" عبدالقادر بن محمد القرشی نے "الجواھر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ" ابراہیم بن محمد ابن دقماق نے "نظم الجمان" مجد الدین فیروز آبادی نے "المرقاۃ الفویۃ فی تراجم الحنیفۃ" تقی الدین الغزی نے " الطبقات

السنية في تراجم الحنفية" قاضی عیاض نے" ترتيب المدارك و تقريب المسالك لمعرفة اعلام مذهب مالك" برہان الدین ابراہیم بن فرحون نے" الديباج المذهب فی معرفه اعيان علماء المذهب" محمد بن حسین بن محمد بن خلف بن احمد بن فراء ابو یعلیٰ بغدادی حنبلی نے "طبقات الحنابلة" لکھیں۔

طبقات الفقہاء پر علاقوں اور مقامات کے اعتبار سے بھی تحریر کی گئیں جن میں ابو بکر عبداللہ المالکی کی "رياض النفوس فی الطبقات علماء القيروان و الافريقيه و زادهم و عبادهم ونسائهم و سير من اخبار هم و فضلائهم و او صافهم" اور ابن عبدالبر القرطبیؒ کی "فقهاء قرطبه" قابل ذکر ہیں۔

2. طبقات القضاۃ

قاضیوں پر پہلی تصنیف غالباً ابو عبید معمر بن المثنی (728ء - 825ء) نے "اخبار قضاة بصره" کے نام سے لکھی۔ أبو عمر محمد بن يوسف بن يعقوب الكندي المصري نے "كتاب الولاة وكتاب القضاة" ابن حجر العسقلانی نے" رفع الإصر عن قضاة مصر " اور ابوالحسن علی بن عبداللہ المالکی نے "تاریخ قضاة اندلس" تحریر کیں۔

3. طبقات القراء

طبقات القراء پر پہلی کتاب خلیفہ بن خیاط نے لکھی، حافظ ذہبی اور شیخ محمد بن الجزری نے بھی "طبقات القراء" کے عنوان سے کتب تحریر کیں۔

4. طبقات المفسرین

جلال الدین سیوطی اور محمد بن علی الداؤدی المالک نے اس فن پر "طبقات المفسرين" کے نام سے تصنیفات لکھیں۔

5. طبقات النحاۃ اللغویین

علم نحو کے ماہرین کے طبقات پر پہلی کتاب محمد بن یزید المبرد نے "طبقات نحاة البصريين" لکھی نیز تقی الدین ابن قاضی شہید نے "طبقات النحاة واللغويين" اور سیوطی نے "بغية الوعاة فی طبقات اللغويين و النحاة" تالیف کیں۔

6. طبقات الشعراء والادباء

حاجی خلیفہ نے اپنی کتاب میں اس فن پر سینتالیس کتب کے نام ذکر کئے ہیں جن میں سے مشہور کتب حسب ذیل ہیں۔

طبقات الشعراء پر پہلی کتاب غالباً إسماعيل بن أبي محمد اليزيدي کی ہے جنہوں نے "طبقات الشعراء" لکھی اس کے علاوہ محمد بن حبیب نے کتاب "اخبار الشعراء طبقاتهم" ابن قتیبہ الدینوری نے "الشعروالشعراء" المبارک بن ابی بکر بن حمدان الموصلی نے" قلائد الجمان في فرائد شعراء هذا الزمان یہ کتاب بعقود الجمان في شعر هذا "کے نام سے بھی مشہور ہے، تصنیف کیں۔

7. طبقات الصوفیہ والزھاد

طبقات صوفیا پر کتاب ابو عبداللہ محمد بن علی بن الحسن بن بشر حکیم ترمذی کی ہے۔اس کے بعد المغرب کے ابو العرب محمد بن احمد التمیمی نے "طبقات عبادالفريقية" لکھی علاوہ ازیں ابو سعید محمد بن علی النقاش نے "طبقات الصوفيه" الاصبھانی نے "حلية الاولياء و طبقات الاصفياء" اور ابن الملقن عمر بن علی الشافعی نے "طبقات الاولياء" لکھیں۔

8. طبقات الاطباء والحکماء

اس فن پر اسحاق بن حنین نے "تاريخ الأطباء" اور ابو داؤد سلیمان بن حسان نے "طبقات الاطباء والحكماء" کے نام سے کتب تحریر کیں۔

خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 1: تاریخ اور طبقات کے درمیان فرق کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر 2: طبقات الفقہاء میں مختلف مذاہب کی کتب طبقات کی علیحدہ علیحدہ فہرست بنائیے اور ہر کتاب کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر 3: طبقات الشعراء والادباء پر کتب کس انداز میں تحریر کی گئیں؟ وضاحت کیجیے۔

یونٹ نمبر 9

سائنسی علوم

فہرست عنوانات

یونٹ کا تعارف 154
یونٹ کے مقاصد 155
1- مسلمانوں کا سائنسی علوم سے اولین تعارف 156
2- فراہمی کتب اور تراجم کی سرکاری سرپرستی 157
3- اسالیب ترجمہ 158
3.1- لفظی ترجمہ 158
3.2 - بامحاورہ ترجمہ 159
4- طبقات مترجمین 159
5- نامور مترجمین 160
5.1- حنین بن اسحاق 160
5.2- ثابت بن قرہ الحرانی 161
5.3- یعقوب الکندی 161
5.4- عمر بن الفرخان الطبری 162
6- ترجمہ نگاری کی سرپرستی 162
7- تراجم کی کثرت اور ان کا معیار 163
8- عربوں کے علمی تحقیق کے طریقے 164
9- اسلام اور سائنس 166
9.1- قرآن حکیم اور سائنسی طریق کار 166

9.2-قرآن حکیم اور تسخیر کائنات 167
9.3-قرآن حکیم اور نظم کائنات 167
10-مسلمانوں کے سائنسی کارنامے 168
11-علم طب 169
11.1-علم طب اندلس میں 172
12-علم ہیئت وفلکیات 173
13-علم ریاضی 179
13.1 -حساب 179
13.2-الجبرا 179
13.3-علم الہندسہ 181
14-علم کیمیا (Chemistry)..... 182
15-علم طبعیات (Physics) 185
15.1 -حرکیات 187
15.2-بصریات 188
15.3-علم جر ثقیل (Mechanics).....190
18-علم نباتات (Botany)..... 194
16.1-علم زراعت.....197
17-علم جغرافیہ 200

یونٹ کا تعارف

اسلام کے تبلیغی دین ہونے کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت ان اقوام کے عقائد، اخلاق، معیشت اور معاشرت پر اثر انداز ہوئی جو حلقہ بگوش اسلام ہوئیں یا اسلامی عملداری میں شامل ہو گئیں۔ اسی طرح خود مسلمانوں نے بھی دیگر اقوام کی تحقیقات اور ان کے علوم سے استفادہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

اسلامی تہذیب کا آفتاب جب زمین عرب پر طلوع ہوا اس وقت قرآن حکیم کے الفاظ میں انسانوں نے اپنی بداعمالیوں کے باعث سمندر اور خشکی ہر جگہ فتنہ وفساد کی آگ بھڑکا رکھی تھی تاہم عرب کی حدود کے آس پاس کہیں کہیں علوم کے ادارے ہنوز چراغ سحر کی طرح ٹمٹمارہے تھے۔ مسلمانوں نے ان اداروں سے اس وقت تک کے انسانی علوم کا ترکہ سمیٹا، اسے عربی زبان میں منتقل کر کے اوہام خرافات سے پاک کیا اور اس پر نئی تحقیقات کی بنیاد رکھی۔

ہمارا عہد سائنس کا عہد ہے جہاں زندگی کا کوئی شعبہ سائنس کے اثرات اور اس کے عمل دخل کے بغیر نہیں ہے۔ زمان و مکان کے فاصلے روز بروز سمٹ رہے ہیں۔ علم و فن کی ترقی سے انسان جس برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اس کا تصور بھی ماضی میں محال تھا۔ امریکہ، یورپ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں سائنس نے رہن سہن کے انداز کو یکسر بدل دیا ہے۔ ترقی پذیر ممالک بالخصوص مسلم ممالک بھی سائنسی ترقی کے اس دور میں اصلاً سائنس سے بیگانہ نہیں۔

مسلمان جہاں سائنس کی ایجادات سے دوسروں کی طرح فیض یاب ہو رہے ہیں، وہاں ان کے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی ارتقائی تاریخ میں مسلمانوں کا کیا کردار رہا ہے۔ نامور سائنس دانوں کی فہرست میں کسی مسلمان سائنس دان کا نام نہ پا کر نئی نسل خاص طور پر احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہے اور ان کو یہ احساس ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ ان کے اسلاف کا دامن سائنسی کارناموں سے خالی ہے۔

کچھ عرصہ قبل یہ خیال عام تھا کہ سائنس کی ترقی یورپی اقوام کی مرہون منت ہے۔ رفتہ رفتہ علمی حلقوں میں یہ حقیقت تسلیم کی گئی کہ غیر یورپی اقوام نے بھی سائنس کی ترقی میں اہم حصہ لیا ہے۔ مصر، جنوبی امریکہ، چین اور ہندوستان کی قدیم تہذیبوں کے سائنسی پہلو کو اب تسلیم کیا جانے لگا ہے البتہ مسلمانوں نے قدیم سائنسی ورثے کو سیکھنے، اسے یورپ تک منتقل کرنے اور خود اس ورثے میں نئے اور اہم اضافے کرنے کا جو تاریخی کارنامہ انجام دیا تھا اس کی قدر و قیمت کو تسلیم کرنے میں تعصبات اور تنگ نظری حائل رہی ہے۔ اب پے در پے ایسے حقائق سامنے آرہے ہیں

کہ تنگ نظری کے باوجود تاریخی واقعات کو تسلیم کرنا پڑ رہا ہے اور علمی حلقے مسلمان سائنسدانوں کے کارناموں کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ کو علم ہو گا کہ اسلام نے سائنس کو کس قدر اہمیت دی ہے مسلمانوں نے اس وقت جب دنیا جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور جب کہیں علم کے مدہم آثار موجود بھی تھے اس میں سحر، طلسمات، توہمات اور علم نجوم کی آمیزش پائی جاتی تھی، سائنسی علوم کی بنیاد، تحقیق، تجربہ اور مشاہدہ پر رکھی۔ اسی طرح آپ مسلمانوں کے علم کیمیا، علم طبیعات، علم نباتات اور علم جغرافیہ کے بارے میں خدمات و نظریات کا مطالعہ بھی اس یونٹ میں کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

1. یہ بیان کر سکیں گے کہ مسلمانوں کا سائنسی علوم سے اوّلین تعارف اور انہوں نے یونانی علوم پر مشتمل کتب کیسے حاصل کیں؟
2. عہد عباسیہ کے نامور مترجمین اور ان کے تراجم کے اسالیب کی وضاحت کر سکیں۔
3. یہ واضح کر سکیں کہ ترجمہ نگاری کی سرپرستی کس طرح کی گئی اور مسلمانوں کے علمی تحقیق کے طریقے کیا تھے؟
4. قرآن مجید کے حوالے سے سائنسی تعلیم کی اہمیت کا جائزہ لیں۔
5. مختلف سائنسی علوم میں مسلمانوں کی ایجادات و تحقیقات کے بارے میں تبصرہ کر سکیں۔
6. مسلمانوں کے ان علمی و تحقیقی کارناموں سے متعارف کرا سکیں، جو اس وقت یورپی سائنسدانوں کی طرف منسوب ہیں۔
7. علم کیمیا کے بارے میں مسلمان سائنسدانوں کی خدمات واضح کر سکیں۔
8. علم طبیعات پر مسلمان سائنسدانوں کی کتابوں اور ان کے نظریات پر بحث کر سکیں۔
9. قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی صنعتی ترقی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔
10. علم نباتات اور علم زراعت میں مسلمانوں کے متعارف کرائے گئے اصولوں کی وضاحت کر سکیں۔
11. علم جغرافیہ میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کا جائزہ لے سکیں۔

1- مسلمانوں کا سائنسی علوم سے اولین تعارف

امر مسلمہ ہے کہ اوائل اسلام کے مسلمانوں نے جس علمی تحریک کی پرورش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس کی بنیاد غیر عربی ادب کے مطالعہ پر تھی چنانچہ اس خلیج پر مترجمین نے پل کا کام دیا۔ ان ہی کی مدد سے غیر ملکی علوم یونانی، شامی، قدیمی فارسی اور ہندوستانی زبانوں سے عربی میں منتقل ہوئے۔

تراجم کے ذریعے مسلمان پہلے پہل سائنسی کتب سے متعارف ہوئے۔ اسلامی عہد سے قبل اسکندریہ کے مدرسہ طب کی بعض کتابوں کے تراجم یونانی سے سریانی زبان میں کئے گئے تھے۔ ان کتابوں کا مترجم سرجیس (536ء) راس العین کا رہنے والا مسیحی پادری تھا جس نے اسکندریہ میں طب اور یونانی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ وہ پہلا شخص ہے۔ جس نے یونانی کتب کا سریانی میں ترجمہ کیا۔ اس نے جالینوس کی کم از کم چھبیس کتابوں کا سریانی میں ترجمہ کیا ان میں سے اکثر کتابوں کا تعلق اسکندریہ کے مدرسہ طب کے مقررہ نصاب سے تھا۔

القفطی اور الندیم کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں 19ھ/640ء میں جب اسکندریہ فتح ہوا تو وہاں کا مشہور طبیب اور فلسفی یحیی النحوی زندہ تھا۔ حضرت عمرو بن العاص نے اس کے علمی مقام اور عیسائیوں سے مناظروں کی شہرت سن کر اسے بلا بھیجا، ابطال تثلیث اور فناء عالم پر اس کے فلسفیانہ دلائل جن سے عرب ہنوز ناآشنا تھے آپ انہیں سن کر بے حد مسرور ہوئے اور اسے اپنا ہم مجلس بنالیا۔

اسکندریہ کا مدرسہ طب اگرچہ اسلامی عہد سے بہت پہلے اپنی علمی و تحقیقی حیثیت کھو چکا تھا، وہاں کی عظیم لائبریری عیسائی مذہب کے تعصب کی نذر ہو گئی تھی اور بشپ تھیوفیلس کے فتوائے کفر کی بنا پر 390ء میں جلادی گئی تھی تاہم اس ادارے کی نصابی کتب اور ان کی شروح وغیرہ موجود تھیں۔

یحیی النحوی نے بھی ان میں سے کئی کتب کی شروح لکھی تھیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کی پینتیس کتابوں کی فہرست دی ہے جن میں سے 7 کتابیں ارسطو کی تالیفات کی شروح، 21 جالینوس کی تصانیف کی تفاسیر تھیں جب کہ سات کتابیں اس کی طبع زاد تھیں۔

اسلامی عہد ترجمہ نگاری کا آغاز خالد بن یزید بن معاویہ (م85ھ/704ء) کا رہین منت ہے جس نے خلافت سے محرومی کے بعد معاشرے میں اپنا مقام برقرار رکھنے اور اپنے احباب کو شاہی دربار کی دریوزہ گری سے بے نیاز کرنے کے

لئے طب و کیمیا اور علم نجوم کی متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ مصر کے طبیب اصطفن القدیم نے خالد کے لئے طب و کیمیا کی چند کتابوں کا ترجمہ کیا جن میں: "کتاب الحرارات"، " کتاب الصحیفة الکبیر"، "کتاب الصحیفة الصغیر" اور "کتاب وصیة الی ابنه فی الصنعة" شامل ہیں۔ خالد نے مسلمانوں کے لئے تمام قدیم سائنسی علوم سے تعارف کا دروازے کھولا اور اصطفن القدیم سے جو طب و کیمیا کی کتابیں ترجمہ کرائیں اسلامی عہد میں وہ پہلا ترجمہ تھا۔

2-فراہمی کتب اور تراجم کی سرکاری سرپرستی

خالد بن یزید کی مذکورہ کاوش کی حیثیت ذاتی تھی۔ سرکاری سطح پر سب سے پہلے جس حکمران نے کتب طب کے ترجمہ کی طرف توجہ مبذول کی وہ بنوامیہ کا چوتھا خلیفہ مروان بن حکم (64-65ھ/683-684ء) تھا جس نے (64ھ/683ء) میں بصرہ کے فارسی الاصل یہودی طبیب بماما سرجویہ سے طب کی ایک کتاب کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کرایا۔ یہ کتاب اسکندریہ کے ایک عیسائی پادری اھرون نے لکھی تھی اور "کتاب اھرون الاسکندری المعروف بالکناش" کے نام سے اسلامی عہد میں طب پر پہلی عرب کتاب کی حیثیت سے منظر عام پر آئی۔

لیکن اموی عہد میں ترجمہ نگاری کی تحریک بالعموم محدود اور شخصی رہی۔ اسے عمومی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہوئی۔ عباسی عہد کے ابتدائی ایام سے یہ یونان، اسکندریہ، جندیشاپور، حران اور ہندوستان سے سائنسی کتب منگوانے اور ان کے ترجمے کا کام شروع ہو گیا اور ہارون الرشید کے عہد (786-809ء) تک کتب حکمت کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ اس نے ایک مستقل کتب خانے کی شکل اختیار کر لی۔ جسے بیت الحکمۃ یا خزانۃ الحکمت کا نام دیا گیا جسے بعد میں المامون (813- 833ء) نے مزید کتب کی فراہمی مترجمین کی تقرری اور مراصد فلکیہ کی تعمیر کے ذریعے ترقی دے کر بہت بڑے علمی ادارے میں تبدیل کر دیا۔

المامون نے قیصر روم کو سائنسی کتابوں کی فراہمی کے لیے خط لکھا جس نے اطراف روم میں بڑی تلاش کے بعد جس قدر کتابیں مل سکیں پانچ اونٹوں پر لاد کر بغداد روانہ کر دیں۔ نیز المامون نے حجاج بن مطر، ابن بطریق، سلم، یوحنا بن ماسویہ کو کتابوں کی تلاش کے لئے روم بھیجا۔ حنین بن اسحاق نے کتابوں کی تلاش میں بہت سے شہروں کا سفر کیا۔ اسی زمانہ میں قسطا بن لوقا اپنے شوق سے روم گیا اور فنون حکمت کی بہت سی کتابیں ساتھ لایا۔ المامون کے جذبہ

فراہمی کتب کو دیکھ کر تمام دربار میں جوش پھیل گیا۔ بنو موسی شاکر نے جو المامون کے ندماء تھے ہندسہ، حیل اور موسیقی کے ماہر، روم کے اطراف میں بہت سے ایلچی بھیجے اور فنون حکمیہ کی ہزاروں کتابیں منگوائیں الغرض یہ کہنا تقریباً صحیح ہے کہ یونان، اٹلی، سسلی اور اسکندریہ کا کوئی علمی سرمایہ ایسا باقی نہیں رہا تھا جو مسلمانوں کے ہاں منتقل نہ ہو گیا ہو۔

عربوں کی فتوحات اور سیاسی بالادستی کے باعث اسلامی تہذیب و ثقافت اور عربی زبان و ادب کو قبول عام حاصل ہو گیا۔ ہر علاقے کے اہل علم اور متلاشیان مناصب عربی میں مہارت بہم پہنچانے میں لگ گئے جس کے نتیجے میں بکثرت ایسے اہل علم پیدا ہو گئے جو ایک سے زائد زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ان اہل علم نے علمی، ادبی اور سائنسی کتابوں کے تراجم کو اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا ذریعہ بنایا، دوسری طرف عہد بنو عباس کے آغاز سے ہی سائنسی کتب کے تراجم کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی جس کے باعث ترجمہ نگاری کے فن کو بہت ترویج حاصل ہوئی۔

3-اسالیب ترجمہ

ترجمے کے دو اسلوب تھے:

1. لفظی ترجمہ
2. بامحاورہ ترجمہ

3.1-لفظی ترجمہ

کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان کے ترجموں کی طرف بھی توجہ دی گئی اور جتنا ذخیرہ کتب جمع ہوتا اس کا عربی میں ترجمہ کیا جاتا۔ چونکہ یونانی یا سریانی سے عربی میں تراجم کے پہلے سے کچھ زیادہ نمونے موجود نہیں تھے اس لئے ابتدائی طور پر ترجمے کے کام میں بہت دقت پیش آئی۔ ابتدائی تراجم کا اسلوب لفظی تھا جس میں یونانی کے ہر مفرد لفظ کے نیچے عربی کا مفرد لفظ لکھ دیا جاتا اور کبھی یونانی سے سریانی میں اور سریانی سے عربی میں اسی نوعیت کا لفظی ترجمہ کیا جاتا اور جہاں کسی لفظ کا سریانی یا عربی مترادف نہ ملتا تو یونانی لفظ کو ہی معرب کر کے استعمال کر لیا جاتا جس کی وجہ سے وہ تراجم چیستان ہو گئے جنہیں سمجھنا ممکن نہ تھا۔ یہ طریق ترجمہ یوحنا بن بطریق (م200ھ/815ء) اور عبدالمسیح بن

الناعمی (م220ھ/835ء) کا تھا چنانچہ انہی خامیوں کو دور کرنے کے لئے ہارون الرشید اور المامون کے عہد میں ابتدائی تراجم پر نظر ثانی کر کے ان کی اصلاح کی گئی بلکہ بعض اہم کتابوں مثلاً مجسطی وغیرہ کے کئی مرتبہ تراجے کرائے گئے اور ان میں سے صحیح اور فصیح ترجموں کا انتخاب کیا گیا۔

3.2 - بامحاورہ ترجمہ

یہ حنین بن اسحاق اور اس کے شاگردوں کا طریقہ تھا اس میں مترجم منصف کا ایک پیرا گراف پڑھ کر اس کے مطالب کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا۔ اصل سے لفظی مطابقت پیدا کرنے کے بجائے اس امر پر توجہ دیتا کہ ترجمہ سلیس، سادہ، قابل فہم اور مدعا کو صحت سے واضح کرتا ہو۔

4- طبقات مترجمین

جن حکماء نے نقل و ترجمہ کا کام کیا ان کے طبقات حسب ذیل ہیں۔

(1) عہد اموی کے مترجمین

جن میں سے بعض نے اپنے شوق اور بعض نے کسی کے کہنے سے ترجمے کئے جیسے اصطفن الاسکندری اور ابن المقفع۔

(2) آل ماسرجویہ

ان میں سے پہلا طبّی ماسرجویہ تھا جس کا مذہب یہودیت اور زبان سریانی تھی۔ اس نے اموی عہد میں کتابوں کا ترجمہ شروع کیا اور عباسی عہد (عہد ہارون الرشید) تک ترجمے کرتا رہا۔

(3) آل بخت یشوخ

یہ نسوری عیسائی تھے ان کی زبان سریانی تھی ان میں سے چند مشہور طب اور مترجم ہوئے:

جورجیس بن بخت یشوع: ابن ابی اصبیعہ کے بیان کے مطابق جورجیس پہلا طبیب ہے جس نے المنصور کی خواہش پر طبّی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا۔

- بخت یشوع بن جورجیس (213ھ)
- جبرائیل بن بخت یشوع۔
- بخت یشوع بن جبرائیل (356ھ)۔
- عبیداللہ بن جبرائیل (450ھ)۔

یہ خاندان مختلف ادوار میں نقل و ترجمہ کا کام کرتا رہا۔

5-نامور مترجمین

عباسی دور میں اگرچہ بکثرت مترجم ہوئے لیکن جو لوگ بہترین مترجم تسلیم کئے گئے وہ مامونی دور میں پیدا ہوئے۔ابن ابی اصبیعہ لکھتا ہے:

"اسلامی عہد میں ترجمہ کے ماہر صرف چار افراد تھے: حنین بن اسحاق، یعقوب بن اسحاق الکندی، ثابت بن قرہ الحرانی اور عمر بن فرخان الطبری"۔

ان میں سے حنین بن اسحاق ایک مدرسہ ترجمہ کا بانی تھا۔

ذیل میں حنین اور دیگر معروف مترجمین کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

5.1-حنین بن اسحاق

ابوزید حنین بن اسحاق العبادی (194-246ھ/809-877ء) حیرہ میں پیدا ہوا۔سترہ سال کی عمر میں اس نے پہلا ترجمہ "اصناف الحمیات" کا اور پھر "فی القوی الطبعیہ" کا کیا لیکن بعد میں اس نے ان پر نظر ثانی کی کیوں کہ خود اسے یہ تراجم پسند نہ تھے اگرچہ جبرئیل بن بختیشوع ان کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ رطب اللسان تھا۔

حنین کا نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی زیر نگرانی مترجمین کی ایک جماعت تیار کی جس میں اس کا بیٹا اسحاق خواہر زادہ حبیش بن الحسن الاعسم عیسی بن یحیی اور موسی بن خالد شامل تھے۔ حنین کی طرف منسوب کئی ایک تراجم درحقیقت اس کے انہی شاگردوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ حنین زیادہ تر یونانی سے سریانی میں ترجمہ کرتا جسے اس کے

شاگرد عربی میں منتقل کرتے اور وہ ان پر نظر ثانی کیا کرتا تھا۔

حنین نے ترجمہ نگاری کے لئے جو اسلوب اختیار کیا وہ تحقیق کے جدید طریقوں سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ حنین کا کام تھا کہ جس طرح ہو سکے یونانی مخطوطات کے اچھے اچھے نمونے جمع کرتا اور پھر ان کے باہمی مقابلے سے ایک منقح نسخہ تیار کرتا اور اگر اس کتاب کا پہلے سے سریانی یا عربی ترجمہ ہوا ہے تو اس کو بغور دیکھنے کے بعد حتی الامکان ٹھیک ٹھیک ترجمہ کر دیتا اور اگر اس کا کوئی شاگرد عربی میں ترجمہ کرتا تو وہ خود اس ترجمہ کا یونانی متن سے موزانہ کر کے اس کی تصحیح کرتا تھا۔

5.2- ثابت بن قرہ الحرانی

حنین بن اسحاق کے بعد مترجمین میں سب سے قدآور شخصیت ابو الحسن ثابت بن قرہ کی تھی ثابت 211ھ/876ء/یا 221ھ/836ء میں حران میں پیدا ہوا۔ ثابت بن قرہ نے یونانی کتب کے ترجمہ کے کام کو ترقی دی اور ترجمے کی خامیاں دور کرنے اور اسے عام فہم بنانے کی مقدور بھر سعی کی، مثلاً اقلیدس کا ترجمہ حنین بن اسحاق نے عربی میں کیا تھا، ثابت نے اس پر نظر ثانی کی اور اسے مزید سلیس کیا۔

اس نے اپنی نگرانی میں مزید مترجمین کی تربیت کی جن میں عیسی بن اسید النصرانی سریانی سے عربی میں ترجمہ کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ ثابت مترجمین کے نسطوری گروہ کا قائد تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے اپنے رفقاء کی مدد سے قدیم یونانی فلکیات اور ریاضی کو عربی میں منتقل کیا۔ اپولونیوس، ارشمیدس، اوطیقوس، اقلیدس، تھیوڈوسیوس، بطلمیوس، جالینوس اور یوٹوکیوس کی کتابوں کے تراجم ثابت نے خود کئے یا اپنے ماتحت مترجمین سے کروا کر ان پر نظر ثانی کی۔

5.3-یعقوب الکندی

ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی (185ھ/801ء تا 259ھ/873ء) کی تحقیق کا اصلی میدان فلسفہ تھا، جس کی وجہ سے وہ 'فیلسوف العرب' اور 'فیلسوف الاسلام' کے لقب سے معروف تھا لیکن وہ ان چار مترجمین میں بھی شامل ہے۔ جنہیں ابن ابی اصبیعہ نے اسلامی عہد کے صف اول کے مترجم قرار دیا ہے۔

تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ وہ طب، فلسفہ، حساب، ہندسہ، منطق اور علم نجوم کا ماہر تھا۔ القفطی کے بیان کے مطابق وہ یونانی، فارسی اور ہندی فلسفہ کی تمام شاخوں میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اس نے بالعموم کتب فلسفہ کے ترجمے کئے لیکن

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کن کن کتابوں کے ترجمے کئے اور کن کن زبانوں سے کئے۔

5.4- عمر بن الفرخان الطبری

عمر بن الفرخان الطبری (م200ھ/816ء) طبرستان کا رہنے والا ماہر فلکیات اور فلسفی، فارسی اور عربی میں کامل دست گاہ رکھتا تھا۔ عباسی عہد کے ترجمہ نگاروں میں اسے ممتاز مقام حاصل تھا۔ ابن الندیم کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر تفسیری و توضیحی ترجمے کرتا تھا۔ اس کی تالیفات و تراجم میں:

کتاب القرآنات و تحویل السنین، کتاب المسائل، کتاب الفاق الفلاسفة و اختلافهم فی خطوط الکواکب، کتاب المحاسن، تفسیر الاربع مقالات بطلمیوس من نقل ابی یحیی بن البطریق شامل ہیں۔

6- ترجمہ نگاری کی سرپرستی

عباسی عہد میں ابو جعفر المنصور کے عہد سے ہی سرکاری سرپرستی میں تراجم کا کام شروع ہو گیا جو ایک مدت تک بڑے اہتمام سے جاری رہا۔ خلفاء ترجمہ نگاری کے کام اور مترجمین کی سرپرستی بڑے اہتمام سے کرتے رہے لیکن یہ سرپرستی محض خلفاء تک محدود نہیں رہی بلکہ دوسرے اہل ثروت اور علم دوست افراد بھی اس علمی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

حنین بن اسحاق نے بیس سے زائد افراد کے نام گنوائے ہیں جن کے لئے حنین یا اس کے شاگردوں نے سائنسی کتابوں کے ترجمے کئے۔ یہ افراد دو(2) عمومی طبقات میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک طبقہ امراء، روساء اور سیاسی اہمیت کے حامل اہل علم پر مشتمل ہے۔ ان کی اکثریت مسلمان تھی۔ دوسرا طبقہ مترجمین کے اساتذہ رفقاء اور احباب پر مشتمل ہے یہ بالعموم جندیشاپور یا بغداد کے نسطوری مسیحی اطباء تھے۔ پہلے طبقہ کے لئے جو ترجمے کئے گئے وہ یونانی یا سریانی سے عربی میں کئے گئے اور دوسرے طبقہ کے لئے یونانی یا عربی سے سریانی میں۔

جن افراد کا ابن ابی اصیبعہ نے مترجمین کا سرپرستوں کی فہرست میں ذکر کیا ہے ان میں محمد بن موسی المنجم، احمد بن موسی، علی بن یحیی، محمد بن موسی بن عبدالملک، عیسی بن یونس الکاتب، علی الفیوم، احمد بن محمد الکاتب المعروف بابن

المدبر(270ھ/883ء) ابراہیم بن محمد بن موسی الکاتب عبداللہ بن اسحاق اور محمد بن عبدالملک الزیات (233ھ /848ء) شامل ہیں۔ان میں الزیات عباسی خلیفہ المعتصم کا وزیر تھا، ہر مہینے دو ہزار دینار مترجمین پر خرچ کرتا تھا۔ حنین بن اسحاق نے آٹھ مترجمین کے نام گنوائے ہیں جو اس سے وابستہ تھے۔اس جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عباسی عہد میں مسلمان امراء، روساء اور اعیان دولت نے قدیمی سائنسی اور فلسفانہ کتب کے حصول اور تراجم کے لئے بے دریغ دولت خرچ کی اور تقریباً تمام قدیم معلوم ذخیرہ کتب کا عربی میں ترجمہ کرایا جس سے عالم اسلام کے سائنس دان اور مفکرین ماضی کی علمی کاوشوں سے آگاہ ہو گئے اور ان کے لئے ان کی صداقت جاننا، پرکھنا اور علمی تحقیق کو وسعت دینا آسان ہو گیا چنانچہ یہ علمی ذخیرہ جب مسلمانوں نے دوبارہ یورپ کو منتقل کیا تو اس میں ہزاروں گنا اضافہ ہوا۔

7-تراجم کی کثرت اور ان کا معیار

اسلامی فتوحات کے بعد جب مسلمان یونان و روما کے علمی خزانوں سے متعارف ہوئے تو ان کا فطری شوق موجزن ہوا اور انہوں نے کتابوں کے تراجم کرانے شروع کئے۔ خلفاء اور وزراء سلطنت کی فیاضیوں کے باعث ترجمہ کے کام نے بہت ترقی کی اور یہ کہنا بے جا نہیں کہ سائنس اور علوم طبعیہ کی تمام شاخوں پر موجود یونانی، سریانی، ہندی اور فارسی ذخیرہ عربی میں منتقل کر لیا گیا تھا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تراجم کا معیار کیا تھا:

صاحب کشف الظنون نے تراجم کی کثرت اور ان کے معیار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "چونکہ مامون کتاب کے ہم وزن سونا تول کر دیتا تھا اور مترجمین کو بیش قرار مشاہرہ کے علاوہ صلہ و انعامات سے مالا مال کر دیتا لیکن ترجموں کا مقصد زر طلبی کے سوا کچھ نہ تھا نتیجہ ترجموں کی تعداد تو بڑھ گئی لیکن بہترین کتابوں کے بہت کم ترجمے کئے گئے نیز جن کتابوں کے ترجمے کئے گئے ان کے اصلی معنی قائم نہیں رہے بلکہ ان میں نہایت کثرت سے تحریفات واقع ہوئیں اور ان تحریفات کے ساتھ جو ترجمے کئے گئے وہ مبہم، غیر مفہوم اور ایک دوسرے سے مختلف بھی تھے"۔

لیکن یہ تمام بحث چنداں اہم نہیں ہے۔اس لئے کہ مسلمانوں کا اصلی کارنامہ یونانی علوم کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان علوم کی بنیاد تجربہ اور معاہدہ پر رکھی یونانی علوم و فنون پر تنقیدی نگاہ

ڈالی اور خود بہت کچھ ایجادات واختراعات کیں۔ان کے اصول و قواعد پر اعتراضات کئے اور ان کے رد میں کتابیں لکھیں اور:''خذ ما صفا، دع ماکدر''پر عمل کیا۔

8-عربوں کے علمی تحقیق کے طریقے

عربوں نے تحصیل علوم میں جو مستعدی ظاہر کی وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے۔اس امر کی نہ کوئی مثال پہلے موجود تھی۔نہ اب تک ہے کہ کسی وسیع سلطنت کے طول و عرض میں حکمران طبقے اتنے بڑے پیمانے پر حصول عمل کی مجنونانہ خواہش سے سرشار ہو گئے ہوں۔خلفاءوامراءاپنے محلوں سے اٹھ کر کتب خانوں اور رصد گاہوں میں جا گھستے تھے وہ اپنے امور سلطنت سے عام طور پر غفلت برتتے تھے اور نظم ونسق خاطر خواہ نہ ہوتا تھا لیکن اہل علم کے خطبات سننے اور ان سے مسائل ریاضی کے متعلق مذاکرات کرنے میں ہر گز کوتاہی نہ کرتے۔ مسودات و مخطوطات اور نباتاتی نمونوں سے لدے ہوئے کارواں بخارا سے دجلہ تک اور مصر سے اندلس تک رواں دواں رہتے تھے۔ صرف کتابوں اور معلموں کے حصول کی خاطر قسطنطنیہ اور ہندوستان کو خاص سفیر بھیجے جاتے تھے۔کسی سلطنت سے تاوان جنگ وصول کرنے کے سلسلے میں یونانی مصنفین یا کسی ممتاز ریاض دان کی تصنیف حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملحق ہوتا تھا۔وزرائے سلطنت کتب خانوں کے قیام، مدارس کے لئے اوقاف کے انتظام اور غریب طلبہ کے لئے وظائف کے اہتمام میں اپنے آقاؤں سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔اہل علم کو بلاامتیاز نسل و مذاہب دوسرے سب لوگوں پر فوقیت دی جاتی تھی۔

موجودہ دور میں یہ امر مسلم ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ کو عمدہ سے عمدہ کتاب پر ترجیح ہے۔کتابوں کی افادیت اپنی جگہ تسلیم ہے۔لیکن ان سے وہ علم حاصل نہیں ہوتا جو تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔عین ممکن ہے کہ کسی شخص کا دماغ دوسروں کے علوم وفنون سے بھرا ہوا ہو مگر اس میں خود تحقیقات واختراع کا مادہ نہ ہو اور وہ شاگردی کی حالت سے استادی کی حالت کو پہنچ ہی نہ سکے۔ تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کے مقابل میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے موجد عرب تھے۔

عربوں کو ایران و شام سے جو یونانی علوم کا ذریعہ ملا انہوں نے صرف اس کے ترجمہ پر ہی اکتفانہ کیا بلکہ ان پر تنقید بھی

کی۔ عرب محققین نظریئے کو چنداں اہمیت نہ دیتے بلکہ ٹھوس حقائق کی جمع آوری میں مصروف رہتے تھے۔ یونانی اگرچہ اپنے علوم کو مرتب کرتے، عمومیت دیتے اور نظریات قائم کرتے لیکن صابرانہ تحقیق و تفتیش، مثبت علم کی فراہمی، سائنس کی باریک بینی، مفصل و طویل مشاہدات اور تجربے اور تجسس یہ سب لوازم علمی یونانی مزاج سے قطعاً بعید تھے۔ مسلم سائنس دانوں کے علمی کارناموں سے تحقیق کی نئی روح پیدا ہو گئی، تفتیش کے نئے طریقے معلوم کئے گئے۔ تجربے، مشاہدے اور پیائش کے اسلوب اختیار کئے گئے۔ ریاضیات کو ترقی دی گئی اور یہ سب کچھ ایسی شکل میں نمایاں ہوا جس سے یونانی بالکل بے خبر تھے۔ دنیائے یورپ میں اس روح کو اور ان اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔

ہام بولڈ (Hom Bold)لکھتا ہے:

"علمی ترقی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے ارادہ سے تعین بذریعہ تجربہ و حوادث طبعیہ کو پیدا کر سکے اور عربوں نے یہ درجہ جس سے متقدمین بالکل ناواقف تھے حاصل کر لیا تھا"۔

الغرض عربوں نے یونانی علوم کو ایک شاگرد اور مقلد کی حیثیت سے نہیں پڑھا بلکہ انہوں نے یونانیوں سے جتنے علوم حاصل کئے انہیں دلائل کی کسوٹی پر پرکھا، مشاہدے کی سان پر چڑھایا اور تجربے کی بھٹی سے گزارا۔ نتیجتاً عربوں نے ویونان سے جو علمی ذخیرہ لیا تھا اسے بالکل بدل کر آنے والی نسلوں تک پہنچایا اور طب، کیمیا، جغرافیہ، ریاضی، فلکیات اور حیاتیات غرضے کہ سائنس کے تمام شعبوں میں یونانیوں کی تنقید، تردید اور تصحیح کرتے ہوئے تخلیقی کارنامے انجام دیئے۔

خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1: مسلمان یونانی علوم سے کسی طرح متعارف ہوئے؟ تراجم نگاری میں خالد بن یزید کے کردار پر بحث کیجیے۔

سوال نمبر 2: یونانی علوم کے تراجم کے اسالیب پر مفصل نوٹ لکھیں۔

سوال نمبر 3: مامون الرشید کے عہد میں تراجم کی کثرت کے اسباب کیا تھے نیز اس دور کے تراجم کے معیار پر روشنی ڈالیے؟

9-اسلام اور سائنس

پیغمبر اسلام ﷺ پر جب غار حراء میں پہلی وحی نازل ہوئی اس اہل عرب کی اکثریت نوشت و خواند سے بے بہرہ تھی۔ یہود اور مسیحی جو اہل علم سمجھے جاتے تھے، ان کی علمیت کتب مقدس کی تعلیم اور اس کی من مانی تاویلات تک محدود تھی۔ علم کی جو شمع بابل، نینوی اور مصر میں پہلی قوموں نے جلائی تھی ،ایتھنز کے راستے اسکندریہ پہنچ کر دم توڑ چکی تھی۔ روما کے جنگی تسلط کے باعث مسیحیت کو فروغ حاصل ہوا تو اس نے سیاسی غلبہ واقتدار پر اکتفانہ کیا بلکہ آزاد غور و فکر پر بھی پابندی عائد کر دی ڈریپر کے مطابق:

"مسیحیت کی تاریخ میں سب سے نامبارک وہ دن تھا جب اس نے اپنے آپ کو سائنس سے علیحدہ کر لیا اس نے آریجن کو جو اس زمانہ 231ء میں کلیسا کی طرف سے سائنس کا بہت بڑا وکیل اور سرپرست تھا، مجبور کیا کہ وہ اسکندریہ چھوڑ کر قیصریہ چلا جائے۔ مذہب (مسیحیت) اور سائنس میں باقاعدہ معرکہ کا آغاز اس وقت (414ء) ہوا جب ایک جاہل اور متعصب پادری سینٹ سائرل جو اسکندریہ کا بشپ تھا، کی ایما ہائی (Emahi) پیشہ (ایک یونانی ماہر ریاضیات لڑکی) کو جو لیکچر دینے جا رہی تھی پادریوں نے گھیر لیا اور بیچ بازار کے اس کے کپڑے نوچ کر اسے برہنہ کر دیا اور گھسیٹتے گھسیٹتے ایک گرجا گھر میں لے گئے جہاں عصائے پطرس کی متواتر ضربوں سے اس کا سر توڑا گیا اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے گوشت پوست کو سیپیوں سے چھیدا گیا اور ہڈیاں آگ میں جھونک دی گئیں۔ مدارس بند کر دیئے گئے اور اسکندریہ کا کتب خانہ جس میں سات لاکھ کتابیں تھیں، نذر آتش کر دیا گیا"۔

حران اور جندیشاپور میں علمی روشنی کے مدہم آثار باقی تھے کہ اسلام کا سورج طلوع ہوا اس نے انسانیت کو پہلا پیغام تعلیم کے حصول کا دیا۔

9.1-قرآن حکیم اور سائنسی طریق کار

سائنس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔

1. مشاہدہ
2. غور و فکر

مشاہدات کا تعلق حواس سے ہے اور غور و فکر کا دماغ سے۔ قرآن حکیم کے تقریباً ایک تہائی حصہ میں قدرت کے گوناگوں مظاہر کی طرف توجہ دلا کر مشاہدہ مطالعہ اور غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ انسان اپنے سامنے پھیلی ہوئی وسیع و عریض کائنات اور اس میں موجود تمام ظاہر اور ان میں پوشیدہ سلسلہ اسباب و علل اور اسرار و رموز پر غور و فکر کرے کیونکہ یہ ایک علیم و حکیم خلق کی عظیم الشان تخلیق ہے جس کا کوئی ذرہ بے مقصد نہیں ہے۔

9.2-قرآن حکیم اور تسخیر کائنات

سائنس مادی دنیا کی تسخیر کے منظم طریقے کا نام ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی توجہ تسخیر کائنات کی طرف مبذول کراتے ہوئے انسان کے علم و جستجو کی صلاحیتوں کو مہمیز لگائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ o وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَo (الجاثیہ: 21-31)

"اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر مسخر کر دیئے تاکہ ان میں اس کے حکم کے مطابق کشتیاں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکریہ ادا کرو۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں"۔

9.3-قرآن حکیم اور نظم کائنات

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں بکھرے ہوئے مظاہر فطرت ایسے قانون اور تنظیم سے وابستہ ہیں جس میں کہیں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍo ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیْرٌ (الملک: 3-4)

"کیا تو نے خدا کی تخلیق میں کوئی نقص دیکھا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو آسمان میں کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر بار بار نظر کر، نظر تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی"۔

اسلام نے علم و سائنس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مظاہر فطرت میں غور و فکر کرنا انسان کے لئے فرض قرار دیا ہے۔اس نے تجربہ و مشاہدہ کو حصول علم کے ذریعہ کے طور پر سند مانا اور مختلف شعبہ ہائے علوم کی کی نہ صرف توجہ مبذول کرائی بلکہ اس کے سامنے بے شمار سائنسی حقائق و نتائج پیش کر کے اسے یہ دعوت دی کہ وہ قرآن کی رہنمائی میں کائنات میں ڈوب کر اسرار فطرت کی نقاب کشائی کرے۔

قرآن بنیادی طور پر ہدایت کی کتاب ہے جو گم گشتہ راہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئی۔ سائنسی علوم سے بحث کرنا قرآن کا اصل اور حقیقی موضوع نہیں ہے تاہم ضمناً قرآن حکیم میں مختلف شعبہ ہائے علوم سے متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔ لطفی جمع لکھتے ہیں:

> "وہ کتاب جو افصح العرب پر نازل ہوئی محض ایک مذہبی کتاب نہیں بلکہ تقریباً تین سو علوم کا منبع ہے۔ مثلاً شرع، لغت، تاریخ، ادبیات، طبیعات، فلکیات اور فلسفہ وغیرہ۔ان میں سے اکثر علوم کا براہ راست ماخذ خود قرآن ہے"۔

10- مسلمانوں کے سائنسی کارنامے

سائنس کا آغاز کب ہوا؟ اس کا جواب اسی قدر مشکل ہے جتنا اس سوال کا کہ انسان کی نشو و نما کا آغاز کب ہوا۔ تاہم سائنس کو موجودہ مقام پر پہنچانے کے لیے مسلمانوں نے اپنے خون جگر سے اس شجرہ علم کی آبیاری کی۔ اگرچہ انہوں نے اس کے لئے خام مواد یونان، اسکندریہ اور ہند سے لیا لیکن اس پر جو عظیم علمی عمارت تعمیر کی وہ سراسر مسلم سائنس دانوں کی کاوش تھی لیکن اس کے باوجود مسلمان علماء نے یونان و ہند کے ارباب علم و دانش کے لئے جذبات تشکر و امتنان کے اظہار او اعتراف میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس کے برعکس یورپ نے موجودہ سائنس مسلمانوں سے حاصل کی لیکن ان کے پاس کلمہ اعتراف کیا ہے اور وہ بھی دبی زبان سے۔ بالعموم یورپ کی موجودہ ترقی کا سلسلہ براہ راست طے کر دیا جاتا ہے یورپی زبانوں میں سائنس کی تاریخ، اور سائنس دانوں کے حالات پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں محض گنتی کے چند نام مسلم سائنسدانوں کے آتے ہیں اور وہ بھی انتہائی اختصار کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو میں اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں نے زیادہ تر مسلمانوں کی طبّی خدمات اور فلسفیانہ افکار کو موضوع بنایا ہے اور

سائنس کی مشہور شاخوں مثلاً ریاضی، ہیئت، نباتات اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کی تفصیل سے یہ کتابیں تہی دامن ہیں۔

اس فرو گزاشت سے یہ تاثر پیدا ہونا طبعی امر ہے کہ اسلامی دور کے دانشوروں کا میدان تحقیق صرف طب اور فلسفہ تک محدود تھا اور موجودہ سائنس کی بنیاد یونان و اسکندریہ کی سائنس پر ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یونانیوں نے ہیئت و طبیعت پر چند کتابیں ضرور لکھی تھیں لیکن ان میں تحقیق و جستجو، تجربہ و مشاہدہ، دقت نظر اور حتمی نتائج کے حصول کی کمی تھی بریفالٹ (Breifalt) لکھتا ہے:

"یونانیوں کی قدیم کتابوں میں دو سے زیادہ ایسی چیزوں کا ذکر نہیں ملتا جن کو سائنسی تجربہ کہا جا سکے۔ ایک تو فیثا غورث (Feesa goras) نے تانت کی تھرتھراہٹ معلوم کی دوسرے بطلیموس نے انعطاف کا پتہ چلایا پلائنی نے اپنے زمانے کے علم فطرت کا جو دائرہ المعارف مرتب کیا ان میں بہت سی عجیب و غریب سنی سنائی باتوں کو تو جمع کر دیا لیکن لفظ تجربہ کا ایک دفعہ بھی ذکر نہیں کیا۔ یونان کے مفکرین میں ہمیں ایسے معاملات میں بھی حیرت انگیز لاپرواہی نظر آتی ہے جن کی توثیق و تصدیق نہایت آسانی سے کی جا سکتی تھی۔ مثلاً ارسطو لکھتا ہے کہ شیر کی گردن میں صرف ایک ہڈی ہوتی ہے۔ انسان کی صرف آٹھ پسلیاں ہوتی ہیں۔ مردوں کے دانت عورتوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ دھڑکتا ہوا دل صرف مردوں ہی کے سینے میں ہوتا ہے۔ انڈے سمندر کے پانی پر تیرتے رہتے ہیں اور اگر سمندر کا پانی لاکھ کے برتن میں رکھا جائے تو پینے کے قابل ہو جاتا ہے"۔

جالینوس جو تشریح الاعضاء کے علم پر سند سمجھا جاتا ہے، لکھتا ہے کہ انسان کے زیریں جبڑے میں دو ہڈیاں ہوتی ہیں۔

11- علم طب

قرآن حکیم میں طب اور حفظان صحت کے متعلق انتہائی اہم اصول بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً شہد کو نفع بخش اور شراب، خون، مردار اور خنزیر کے گوشت کو حرام کہا گیا ہے۔ جہاں اچھی غذا کھانے کی اجازت ہے وہاں کھانے میں اعتدال برتنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ اسی طرح احادیث میں حفظان صحت کے کئی اصول بتائے گئے ہیں۔ رسول

اکرم ﷺ صحابہ کو بیماری کے علاج کی تاکید فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ماانزل الله داء الا انزل له شفاء(صحیح بخاری)

"اللہ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کی شفا نہ ہو"۔

مسلمانوں میں یونانی طب کا رواج حکمائے یونان کی ان کتابوں سے ہوا جو یونانی یا سریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ خالد بن یزید (متوفی 85 یا89) نے ذاتی حیثیت سے یونانی طب و کیمیا کی کتب کے تراجم کروائے جب کہ چوتھے اموی خلیفہ مروان بن حکم نے سب سے پہلے سرکاری سطح پر اپنے طبیب ماسرجویہ سے اہرن الاسکندری کی کتاب "الکناش " کا عربی ترجمہ کرایا۔ عباسی عہد میں جو کہ مشرق میں علمی و سائنسی ترقی کا سنہرا دور ہے بغداد میں جندیشاپور، حران اور ہد کے اطباء اکٹھے ہو گئے اور جب ہارون الرشید نے بیت الحکمت کی بنیاد رکھی جسے بعد میں مامون الرشید نے علمی و سائنسی بنیادوں پر منظم کیا اور ہر علم و فن کی کتب جہاں جہاں سے مل سکیں ، جمع کروا کے مختلف مترجمین کے ذریعے ان کے عربی تراجم کرائے تو مسلمان تمام پہلے طبّی سرمائے سے آگاہ ہو گئے۔

علی بن ابن الطبری نے قبول اسلام کے بعد "فردوس الحکمة" کے عنوان سے عربی میں ایک کتاب لکھی جس کا شمار طب کی قدیم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ "فردوس الحکم" کی تصنیف مسلمانوں کے طبّی سفر کا نقطہ آغاز تھا۔ اس میں مصنف نے ادویات کے بارے میں مستند معلومات اور اپنے تجربات جمع کئے ہیں۔

نویں صدی عیسوی میں مشہور مسلمان ماہر طب و کیمیا ابو بکر محمد بن زکریا الرازی پیدا ہوئے جسے یورپ میں (Abubacer اور Rhazes) کہا جاتا ہے۔ سارٹن نے صدی عیسوی کے نصف دوم کو "عہد رازی" سے تعبیر کیا ہے۔

رازی نے مختلف موضوعات پر تقریباً دو سو پچاس سے زائد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں آدھی کتابیں طب پر ہیں۔ طبّی تصانیف میں ان کی کتابیں "الحاوی"، "کتاب الطب المنصوری"، "کتاب الجدری والحصبته" بہت مشہور ہوئیں۔ رازی کی سب سے ضخیم کتاب "الحاوی" ہے جو پچیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ رازی پہلے طبیب ہیں جنہوں نے چیچک اور خسرہ جیسے وبائی امراض پر توجہ دی اور ان پر اپنی کتاب "الجدری والحصبه" میں بحث کی۔

رازی نے طب میں علاج کے کئی نئے طریقے نکالے۔ ول دوران(Will Doran)ان کی چند ایک اختراعات کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں:

"رازی نے کئی نئے علاج متعارف کرائے، جیسے پارے کا لیپ اور زخموں کے ٹانکوں میں حیوانی آنتوں کا استعمال۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے میں قارورے کا معائنہ کرنے کی سرگرمی بند کر دی جب اطباء تشخیص کے لئے قارورے کا معائنہ کرنے کے عادی تھے حتیٰ کہ کبھی وہ مریض کو دیکھے بغیر ایسا کرتے تھے"۔[27]

علی بن عباس (متوفی 483ھ) کی کتاب "كامل الصناعة" جو "كتاب الملكی" کے نام سے معروف ہے، علم طب پر بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس میں انہوں نے طب عملی، علمی تشریح، علم جراحت وغیرہ پر گفتگو کی ہے۔ علی بن عباس نے اپنی کتاب میں "ذات الصدر" اور "علم الجنين" کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ آج بھی درست ثابت ہوئی ہیں۔

ابن سینا (824ھ) کی شہرہ آفاق تصنیف "القانون فی الطب" ہے جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے یہ کتاب مشرق اور مغرب میں صدیوں تک طب کی اساس بنی رہی۔ اس کتاب کے پانچ حصے ہیں پہلے حصے میں اصول طب، دوسرے میں ادویہ مفردہ، تیسرے میں امراض اعتضائے خاصہ، چوتھے میں امراض عامہ اور پانچویں میں ادویہ مرکبہ کا بیان ہے۔

ان کی ایک کتاب "رساله جوديه" ہے جس میں امراض چشم کی علامات، دانتوں کی تکالیف کے اہم نسخے، معدے کے درد کے لئے ادویہ کے علاوہ بواسیر کے علاج کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

الحسن علاالدین علی بن ابی الحزم جو ابن النفیس کے نام سے مشہور ہیں، نے طب کے موضوع پر وسیع ذخیرہ تحریری شکل میں چھوڑا ہے۔ اگرچہ وہ ایک شارح کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مگر انہوں نے کتابوں کے بجائے اپنے تجربات اور مشاہدات پر انحصار کیا ہے امراض چشم پر ان کی کتاب " المذهب فی الكحاله " کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن النفیس نے طب کے موضوع پر " كتاب الشامل فی الصناع الطبّيه" کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کرنے کا بیڑہ اٹھایا جو تین سو جلدوں پر محیط ہوئی مگر وہ اس کی صرف اسی جلد ترتیب دے سکے۔ انہوں نے "شرح تشریح القانون" کے نام سے "القانون" کی شرح لکھی۔ بیسویں صدی کے وسط تک مشہور تھا کہ دوران خون کی دریافت سپین کے مائیکل سرفیٹس (Michael sarfatus)(1553ء) اور انگریز طبّی بولیم ہارے (Boliam Hary)

---

[27] (The Age Of Faith:P.323)

(1657ء) نے کی مگر اب پتہ چلا ہے کہ دوران خون کی دریافت اصل میں ابن النفیس کا رنامہ ہے جنہوں نے دوران خون کے متعلق صحیح نظریہ اپنی کتاب "شرح تشریح القانون" میں بیان کیا ہے۔ فلپ کے ہٹی (Philaps k hitti) لکھتے ہیں کہ

"ابن النفس نے شرح تشریح القانون میں سرفیٹس جس سے یہ دریافت منسوب ہے سے ڈھائی سو سال پہلے پھیپھڑوں میں دوران خون کا واضح تصور پیش کیا"۔(History of Arabs,P685)

11.1- علم طب اندلس میں

اندلس نے بھی طب کے میدان میں قابل فخر خدمات سرانجام دیں ہیں۔ یہاں چند مشہور اندلسی اطباء کی طب کے حوالے سے خدمات کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

(1) ابوالقاسم الزہراوی

ابوالقاسم الزہراوی (404ء) جو الحکم الثانی کا درباری طبیب تھا، نے علم جراحت کو اپنی تحقیقات کا خصوصی موضوع بنایا اس نے سرجری کی بنیاد علم تشریح پر رکھی اور جدید علم جراحت کا موجد اور قرون وسطی کا سب سے بڑا سرجن قرار پایا۔

الزہراوی نے علاج بالکی یعنی زخموں کو جلانے یا داغنے (Cauterization) مثانہ کی پتھری کو پسینے اور آپریشن کے ذریعے سے نکالنے، آنکھوں اور دانتوں کی سرجری، قطع اعضاء اور پٹی باندھنے کے عملی طریقے بیان کئے نیز انہوں نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو توڑنے اور ٹوٹی ہوئی چپنی کی ہڈی کو آپریشن سے الگ کرنے کے طریقوں کی وضاحت کی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جراحی آلات کے ذریعے وضع حمل کرانے کا طریقہ ایجاد کیا جسے آج (Walcher Position) کہتے ہیں۔ انہوں نے کٹی ہوئی شریانوں کا خون بند کرنے کے لئے انہیں باندھنے اور ہڈیوں کو جوڑنے کے بعد ان پر پلستر چڑھانے کے طریقے بتائے۔ زخموں کو ٹانکے لگانے کے لئے موزوں دھاگوں اور آنتوں کا استعمال کرنا بھی ان ہی کی اختراع ہے۔ مزید برآں آپریشن سے پہلے مریض کو مسکن دوائی کھلانا بھی الزہراوی کی ایجاد ہے۔

الزہراوی نے آلات جراحی کی ساخت پر بھی توجہ دی۔ وہ جراحی میں درکار آلات قرطبہ کے کاریگروں سے اپنی نگرانی میں تیار کرواتے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں تقریباً دو سو ایسے آلات کی تصویریں دی ہیں جو عمل جراحی میں درکار ہوتے

ہیں۔ان میں سے اکثر آلات انہوں نے خود ایجاد کئے۔

(2)عبدالملک بن ابی العلاء زہر

اندلس کے اطباء میں ابن زہر کا مقام بہت نمایاں ہے۔ان کی سب سے مشہور تصنیف ''التیسیر فی المداوات والتدبیر'' ہے جس میں تیس رسالے ہیں۔ابن زہر نے بعض ایسی بیماریوں کی تفصیل بیان کی جو اس سے پہلے اطباء کو معلوم نہیں تھیں۔ مثلاً پردہ شکم کے اوپر پھیپھڑوں کے درمیان خالی جگہ میں رسولی کا پیدا ہونا، دل کے بیرونی غلاف پر پھوڑوں کا نمودار ہونا، حلق کا فالج، خارش، کان کا درمیانی حصہ متورم ہونا اور انتڑیوں کا گھلنا وغیرہ۔انہوں نے بعض ایسی رسولیوں کا ذکر سب سے پہلے کیا جن پر ان سے پہلے کسی نے بحث نہیں کی تھی۔ابن زہر نے نرخرے یا حقنہ کے ذریعے مصنوعی طور پر غذا کی ترسیل کے عمل کی وضاحت کی اور طبیعت و آب وہوا کی معالجاتی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے اور اکھڑی ہڈی کو جوڑ پر بٹھانے کے طریقے ایجاد کئے۔

(3) ابن رشد

اندلس کے مسلم اطباء میں ابن رشد کا نام بھی طب کی تاریخ کا روشن باب ہے انہوں نے "الکلیات فی الطب" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی جو لاطینی دنیا میں (Colliget) کے نام سے مشہور ہوئی۔ول دوران ابن رشد کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے پردہ چشم پر عمل کی تشریح کی اور سب سے پہلے پتہ چلایا کہ چیچک کے حملے کا شکار مریض بعد میں اس سے مامون رہتا ہے یعنی چیچک کا حملہ صرف ایک بار ہوتا ہے۔

12- علم ہیئت و فلکیات

اسلام سے قبل عربوں کا علم نجوم سے کسی حد تک شغف تھا لیکن ان کے ہاں نہ تو فلکیات کے منظم مطالعہ کا کوئی اہتمام تھا نہ صحیح ارصادات کا شعور۔ وہ بادیہ نشین تھے اس لئے علم نحو سے ان کا ہدف ہواؤں کے احوال، موسموں کے تغیر اور شمسی و قمری تقویم کی آگاہی سے آگے نہ بڑھا۔

اسلام نے بالعموم مظاہر فطرت اور بالخصوص فلکی مشاہدات کی ترغیب دی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام

نے نجوم وجوتش کی سختی سے بیخ کنی کر کے علم غیب کے عقیدہ کی بار بار وضاحت کی۔ ان احکام کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم ہیئت کو پہلی بار نجوم کے ڈھکوسلوں سے آزاد کر کے سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔

عباسی عہد میں عربوں اور عجمیوں کے اختلاط کے باعث بغداد علوم وفنون کا مرکز بن گیا۔ خلفاء کی ذاتی دلچسپی کے باعث فقہ، طب اور نجوم سے لوگوں کا شغف بڑھ گیا۔ یونانی اور ہندی کتب ہیئت کے تراجم کئے گئے اور تحقیقات کو آگے بڑھانے کے لئے خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں بغداد کے محلہ شماسیہ میں شاہی حکم کے مطابق نو مسلم انجینئر ابو طیب سند بن علی (متوفی 224ھ) کی سرپرستی میں ایک رصد گاہ تعمیر کی گئی۔ مامون ہی کے عہد میں دمشق کے جبل قاسیون پر ایک اور رصد گاہ کا قیام عمل میں آیا جس کے سربراہ حکیم یحیی بن منصور (متوفی 214ھ) مقرر کئے گئے۔ ان دو رصد گاہوں کے علاوہ بغداد کے تین ماہرین ہیئت بھائیوں احمد بن موسی بن شاکر، محمد بن موسی بن شاکر اور حسن بن موسی بن شاکر نے دریائے دجلہ کے کنارے باب الطاق میں اپنے مکان کے اندر ایک رصد گاہ قائم کر رکھی تھی۔ چوتھی صدی ہجری میں سلطان شرف الدولہ نے بغداد میں ایک رصد گاہ تعمیر کرائی جس میں عبدالرحمن الصوفی (متوفی 386ھ) ابوالوفاء محمد بن احمد البوزجانی (388ھ) اور احمد الصاغانی (379ھ) کام کرتے تھے۔

مصر میں فاطمی خلیفہ الحاکم کو فلکیات سے دلچسپی تھی۔ ان کے دور میں قاہرہ کی رصد گاہ پایہ تکمیل کو پہنچ گئی جس کی تعمیر کا آغاز ان کے والد نے شروع کیا۔ مصر کے مشہور ہیئت دان ابن یونس نے اسی رصد گاہ میں فلکیات پر بڑی اہم تحقیقات انجام دیں۔

سلجوقی سلاطین میں جلال الدین ملک شاہ (475ھ) نے رے میں ایک رصد گاہ بنوائی جس میں عمر خیام کی نگرانی میں فلکیات پر تحقیق کی جاتی تھی۔ 823ھ میں تیموری شہزادے الغ بیگ نے سمرقند میں ایک رصد گاہ قائم کی جس میں قاضی زادہ رومی اور الکاشی جیسے عظیم سائنس دان کام کرتے تھے۔ سمرقند کی رصد گاہ کی پیروی عالم اسلام کے دوسرے شہروں میں بھی کی گئی۔ صرف ہندوستان میں جے پور، اجین، دہلی، متھرا اور بنارس میں پانچ رصد گاہوں کا قیام عمل میں آیا۔ مسلمانوں نے آخری اہم رصد گاہ استنبول میں قائم کی جو 983ھ اور 985ھ کے درمیان تعمیر ہوئی ان رصد گاہوں نے علاوہ اسلامی دنیا کے مختلف شہروں میں چھوٹی چھوٹی رصد گاہیں تھیں جہاں ماہرین فلکیات پر کام کرتے تھے۔

علم ہیئت مسلمانوں نے جن قوموں سے اخذ کیا ہے ان کے یہاں اس کی حیثیت زیادہ تر نظری علم کی تھی۔ یونان کے علم کا ہر طرف شہرہ تھا لیکن افلاک ونجوم کا مشاہدہ کرنے کے لئے ان کے پاس معمولی آلات تھے۔ مسلمانوں نے سب سے

پہلے آلات سازی کی تنصیب اور ان کی استعمال کی طرف توجہ دے کر ہیئت کو سائنسی بنیادوں پر کھڑا کیا۔ الفرازی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اصطرلاب تیار کیا۔ محمد بن موسی الخوارزمی نے اصطرلاب اور اصطرلاب سازی کے موضوع پر دو کتابیں قلم بند کیں۔ جابر بن سنان نے رصد کا ایسا آلہ ایجاد کیا جس سے زاویوں کی پیائش منٹوں تک کی جاسکتی تھی۔ اس آلے کو کردی اصطرلاب (Spherical Astrolabe) کا نام دیا گیا۔

اصطرلاب کے فن پر مختلف علماء نے کتابیں تحریر کیں۔ اس کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل الزرقالی نے ایجاد کی۔ جس کا نام صحیفہ زرقالیہ پڑا۔ صحیفہ زرقالیہ کی ایجاد علم ہیئت میں بجائے خود ایک ایسا کارنامہ تھا جو مشرق و مغرب کی فلکیاتی تاریخ میں موضوع بحث بن گیا۔ علی بن عیسی الاصطرلابی نے ایک اور آلہ سدس (Sextant) ایجاد کیا جس سے کم سے کم فاصلہ کی پیائش کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے ثالث (Triquetrum) اور تکونی آلے، عکس ساز آلے، آنکھ کے پہناوے مزولے (Quardrant) اور زاویہ گیر (Dioptra) بنائے صحیح اور درست پیائش کے لیے ابن سینا نے آج کے اور نیر کی طرح ایک آلہ تیار کیا۔ وقت کی پیائش کے لئے مسلمانوں نے کئی طرح کی گھڑیاں ایجاد کیں۔ گھڑی میں پنڈولم کا استعمال سب سے پہلے انہوں نے کیا۔

افلاک اور اجرام سماوی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انہوں نے آسمانی گلوب تیار کئے جن میں ستاروں کے جھرمٹ متناسب حجم کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ ول دورا (Will Doran) ایک آسمانی کرے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> "1081ء میں ابراہیم السعدی نے معلومات کے مطابق قدیم ترین آسمانی گلوب بنایا پیتل کے اس کرے کا قطر 209 ملی میٹر (181.5 انچ) تھا اس کی سطح پر ستاروں کے 47 جھرمٹ کندہ کرائے گئے تھے جن میں 1015 ستارے ان کے حجم کے تناسب سے دکھائے گئے تھے"۔ [28]

فلکیات کے شعبے میں محمد بن جابر البتانی کی خدمات اور دریافتیں بہت اہم ہیں انہوں نے اپنے مشاہدات کی روشنی میں مشہور یونانی ہیئت دان بطلیموس کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے اس کی تصحیح کی اور ان کے بتائے گئے غلط تخمینوں کی جگہ درست اور صحیح یا کم از کم آج کی تسلیم شدہ مقداروں سے بڑی حد تک قریب قیمتیں دریافت کیں۔ فرانس کے

---

[28] The Age Of Faith,P:329

ایک سائنس دان لالندا(Lananda) (1807)نے البتانی کو تاریخ عالم کے ان بیس سر کردہ ہیئت دانوں میں شمار کیا ہے جو فلکیات کے امام گزرے ہیں۔

مسلمانوں کے فلکیاتی کارنامے تذکرہ نگاری میں دب کر رہ گئے ہیں۔عام طور پر مسلم سائنس دانوں کے سوانحی تذکروں پر ان کے کارناموں کی بہ نسبت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ان کے علمی انکشافات اور ایجادات علمی انداز میں پیش نہیں کئے جاتے۔یورپ اور امریکہ کے مصنفین نے مسلم سائنسدانوں کے ایسے انکشافات کا ذکر کیا ہے جن سے مسلمان بے خبر ہیں۔ہیئت کا میدان بھی ایسے انکشافات اور علمی خدمات سے خالی نہیں ہے جو مسلمانوں کا طرہ امتیاز ہیں۔ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

1. مسلم سائنسدانوں نے زمین کا صحیح محیط معلوم کرنے کی کوشش کی۔عہد عباسی میں خلیفہ مامون الرشید نے الفرغانی اور ان کے ہم کار سائنسدانوں کو حکم دیا کہ بطلیموس کے افکار کو تجربہ اور مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور زمین کا محیط معلوم کیا جائے۔چنانچہ مسلم سائنسدانوں نے زمین کی دو مرتبہ الگ الگ طریقوں سے پیائش کی۔پیائش کے بعد الفرغانی نے حساب لگایا تو زمین کا محیط 25009 میل نکلا۔جبکہ زمین کا اصلی محیط 24858 میل ہے۔ان کے بعد البیرونی نے زمین کا محیط دریافت کرنے کی کوشش کی جو الفرغانی کے مقابلے میں زیادہ بار آور ثابت ہوئی،البیرونی کا معلوم کیا ہوا محیط 24779 تھا۔الفرغانی کے بتائے گئے محیط میں صرف 151 میل کا فرق ہے اور البیرونی کے معلوم کئے گئے محیط اور آج کے محیط میں یہ فرق گھٹ کر محض 87 میل رہ جاتا ہے۔
2. فلکیات میں مسلمانوں کی ایک قابل قدر خدمت یہ ہے کہ انہوں نے دائرہ البروج کے انحراف کی وہ مقدار معلوم کی جو یونانیوں کی دریافت کی ہوئی مقدار سے زیادہ صحیح اور حقیقت حال کے مطابق ہے۔مسلم ہیئت دانوں نے اس سلسلے میں جو کوششیں کی ہیں ان کی تفصیل ڈریپر(Draper)نے اس طرح دی ہے:

830 AD	Almaimo	(المامون)	23	35	"52
AD 879	Albategnius at Aracte	(البتانی بمقام رقہ)	23	35	"00
AD 987	Abul Wefa,at Bagdad	(ابوالوفاء بمقام بغداد)	23	35	"00

AD 995	Aboul Rihan	(ابوریحان البیرونی)	23	35	"00
AD 1080	Arzachael	(االزرقالی)	23	34	"00

مامون الرشید کی دریافت کئی گئی مقدار میں 52 سکینڈوں کا اضافہ اور الزرقالی کی بتائی گئی قیمت میں اصل قیمت سے ایک منٹ کم ہے۔ البتانی یاابوالفواء بوزجان اور البیرونی کی دریافت کی ہوئی مقداریں درست اور صحیح ہیں۔ ان کے علاوہ ابن یونس نے انحراف دائرۃ البروج کی مقدار 32.25 دریافت کی تھی، انہیں شامل کیا جائے تو دستیاب شواہد کی حد تک ہی چار مسلم ماہرین فلکیات ایسے ہیں جن کی معلوم کی ہوئی قیمتیں درست ہیں۔

3. سیاروں کی سالانہ حرکات کا موضوع بھی مسلمانوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے سمرقند کی رصد گاہ میں تیار کی گئی فلکیاتی زیج جرجانی (زیج گورگانی) جو الغ بیگ کے زمانے میں مرتب کی گئی، اس موضوع پر حیرت انگیز نتائج سامنے لاتی ہے۔ الغ بیگ کے نام (لقب گورگان) سے معنون اس فلکیاتی جدول میں مسلم سائنسدانوں کی ذہنی صلاحیتوں کا قابل لحاظ مظاہرہ ہوا ہے۔ زیج میں پانچ روشن سیاروں کی سالانہ حرکات کی مقداریں اور جدید دور کی قیمتیں چند سیکنڈوں کے فرق کے ساتھ اتنی مطابقت رکھتی ہیں کہ عقل چکرا جاتی ہے۔ الغ بیگ کے زمانے کی دریافت کردہ قیمتوں اور آج کے دور کی معلوم کی ہوئی قیمتوں کا موازنہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ جدید دور کی قیمتیں دو مشہور ہیئت دانوں Alembert اور Lalande نے معلوم کی ہیں۔

نام سیارہ	الغ بیگ کی دریافت کردہ مقدار			اصل مقدار			ہیئت داں جس نے اصلی قیمت معلوم کی
زحل	39"	13	12	36"	13	12	D.Alembert
مشتری	34"	20	30	31"	20	30°	D.Alembert
مریخ	15"	20	191	31"	17	191°	Lalande
زہرہ	32" 22°4	17		30"	17	22°4	Lalande
عطارد	13"	43	53	3"	43	53°	Lalande

زحل، مشتری، ریخ اور زہر کی سالانہ حرکات کی جو مقداریں الغ بیگ اور ان کے سائنس دانوں نے دریافت کی ہیں ان میں اور جدید دور کی قیمتوں میں بالترتیب 2,5,3,3 سیکنڈوں کا فرق ہے۔ گویا چاروں سیاروں کے متعلق قیمتوں میں زیادہ سے زیادہ فرق پانچ سیکنڈ ہے۔ ان میں سے دو سیاروں کی قیمتوں میں یہ فرق گھٹ کر صرف 3 سیکنڈ اور

ایک کی قیمتوں میں سے گھٹ کر صرف 2 سیکنڈ رہ جاتا ہے۔ عطارد سیاروں میں زیادہ تیز رفتاری سے گردش کرتا ہے جس سے مشاہدے میں غلطی کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ اس لئے یہ فرق بڑھ کر دس سیکنڈ ہو گیا ہے۔

4. فلکیات میں مسلمانوں کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شمسی سال کا ایسا کیلنڈر تیار کیا جو موجودہ مروجہ گریگورین کیلنڈر سے بھی بہتر ہے۔ مسلمانوں نے شمسی سال کا طور مدت معلوم کرنے کی پہلی کوشش مامون الرشید کے عہد میں تھی۔ اس کے بعد تیسری صدی ہجری میں البتانی نے سال کی لمبائی معلوم کر لی۔ انہوں نے سال کی جو مدت دریافت کی وہ یونانیوں کی بتائی گئی مدت کے مقابلے میں آج کی تسلیم شدہ مدت کے زیادہ قریب ہے۔ جلال الدین ملک شاہ کے عہد میں عظیم ہیئت داں اور ماہر ریاضی عمر خیام نے تاریخ جلالی کے نام سے ایک کیلنڈر تیار کیا۔ انہوں نے تحقیق و مشاہدے کے بعد شمسی سال کی اوسط طول مدت معلوم کی جو جدید طرز بیان کے مطابق 365.2424 دن قرار پائی۔ مروجہ گریگورین کیلنڈر میں جسے ہم سن عیسوی کہتے ہیں یہ اوسط مدت 365.2425 دن ہے۔ شمسی سال سے 0.0003 دن کی زیادتی ہے جو صرف 3333 برسوں میں جمع ہو کر ایک دن بن جائے گی، اس وقت تاریخ میں ایک دن کا فرق پڑے گا اس کے برعکس خیام نے جو کیلنڈر تیار کیا وہ آج کے کیلنڈر سے اس بنا پر بہتر ہے کہ اس میں اصلی شمس سال سے جو سورج کی سالانہ گردش کی تکمیل پر منحصر ہوتا ہے، صرف 0.0002 دن کی زیادتی ہے جو پانچ ہزار برسوں میں ایک دن ہو جائے گا گویا مروجہ گریگورین کیلنڈر میں میں ایک دن کا فرق صرف 3333 برسوں کے بعد پڑے گا جبکہ خیام کیلنڈر میں ایک دن بدلنے کی ضرورت 5000 سال بعد پڑے گی۔

جدید کیلنڈر کے ارتقاء کے ماہر کیلوئیس (Calvius) کا بیان ہے کہ کوپر نکس (Coper niks) وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سال کی بالکل صحیح مدت دریافت کی۔ مگر موصف کا یہ بیان صحیح نہیں ہے، کوپر نکس نے پاپائے روم کی ایما پر کیلنڈر کی درستی کے لئے چند اصلاحات تجویز کیں اور سال کی درست مدت معلوم کرنے کی کوشش کی مگر انہیں وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو ان سے چار سو سال پہلے عمر خیام کے حصے میں آئی تھی۔ بعد کے سائنسدانوں نے واضح کر دیا ہے کہ سال کے طول اوسط میں کوپر نکس سے اٹھائیس سیکنڈ کی غلطی ہوئی ہے جب کہ خیام کی دریافت سال کے اصلی طول اوسط سے صرف 11.3 سیکنڈ زیادہ ہے۔ خیام کی اس قابل داد ہنر مندی کا اعتراف عیسائی مورخوں اور مستشرقین نے بھی کیا ہے۔

13-علم ریاضی

عرب درج ذیل علوم پر ریاضیات کا اطلاق کرتے تھے۔

حساب ، ہندسہ ، الجبرا، فلکیات، مثلیات، موسیقی ، لیکن علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ریاضیات کی مختلف شاخیں مستقل علوم کی حیثیت اختیار کرتی گئیں۔ موسیقی ایک الگ فن قرار پایا۔ مثلیات پر کتب فلکیات میں بحث کی جاتی اور باقی تینوں علوم پر ریاضی کا اطلاق ہونے لگے۔

13.1 -حساب

اسلامی عہد میں حساب کی پہلی کتاب محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی کتاب الحساب ہے۔اس کتاب نے یورپی ریاضیات پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ یورپ میں الخوارزمی کے ذریعہ حاصل ہونے والے نظام حساب کو Algorism کا نام دے دیا گیا۔

13.2-الجبرا

الخوارزمی نے "الجبرا پر کتاب المختصرمن حساب الجبر و المقابله" بھی تصنیف کی۔اس میں الجبرا کو ایک مستقل سائنس کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں الجبرا کا موجد کہا جاتا ہے۔الخوارزمی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حساب میں ایک نیا نظام متعارف کرایا۔ان سے پہلے گنتی کا وہ طریقہ رائج تھا جسے تختہ شمار (Abacus) کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ خاصا دقت طلب تھا اس میں بار بار اعداد کو مٹانا پڑتا تھا۔الخوارزمی نے اپنی کتاب میں وہ عدد نظام پیش کیا جسے یورپ والے اور عرب Arabic Numerals "هندی اعداد" کہتے ہیں۔

ریاضی میں الخوارزمی کا ایک بڑا کارنامہ صفر کی ایجاد ہے۔الجبرا کے موضع پر ابو کامل کی کتاب "کتاب فی الجبرو المقابله" کے نام سے معروف ہے اس میں انہوں نے الخوارزمی سے آگے بڑھ کر مسائل کا حل پیش کیا ہے، وہ پہلے ریاضی دان ہیں جنہوں نے X^2 سے بڑی قوتوں کو استعمال کیا ہے۔

چوتھی صدی ہجری کا زمانہ مسلم ریاضیات کے لئے بار آور موسم تھا اس عہد میں جو ریاضی دان پیدا ہوئے ان

میں ابو جعفر محمد بن الخراسانی جو "الخازن" کے نام سے مشہور ہیں کی خدمات اہم مانی جاتی ہیں۔ ریاضیات پر ان کی کتب "كتاب المسائل العدديه"اور"مطالب الجزيه ميل ميول الجزيه والمطالع الكرة المستقيمة"ہیں۔ نصیر الدین طوطی نے مطالب الجزیہ سے قائمۃ الزاویہ کردی مثلثوں کے جیب (Sine)کا مسئلہ نقل کیا ہے۔ان دونوں کتابوں کے علاوہ انہوں نے اقلیدس کی شرح بھی تحریر کی جس میں انہوں نے اقلیدس کی پانچویں مشق کا نامکمل ثبوت فراہم کیا۔ الخازن کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مخروطی اشکال کا استعمال کرکے اس سہ درجی مساوات کا حل نکالا جو مسئلہ الماہانی کے نام سے مشہور ہے یعنی $x^3+a^2b=cx^2$ عمر خیام کا بیان ہے کہ الخازن پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ مسئلہ حل کیا۔

ابو محمد حامد بن الخضر الخجندی (391ھ) ریاضیات میں خاص مقام رکھتے ہیں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ثابت کیا ہے کہ دو مکعب عددوں کا مجموعہ مکعب عدد نہیں ہو سکتا۔

علوم ریاضیہ میں ابن الہیثم کی خدمات شک و شبہ سے بالا تر ہیں۔ انہوں نے ریاضی کے چند ایسے مسائل کو حل کیا ہے جو اس کے عہد تک لاینحل تصور کئے جاتے تھے۔ نویں صدی میں سہ درجی مساوات کا جو مسئلہ الماہانی سے حل نہ ہو سکا تھا وہ ابن الہیثم کے زمانہ تک برابر موضوع بحث چلا آرہا تھا۔ ان کے زمانے میں یا کچھ پہلے الخازن نے مسئلہ الماہانی کا حل نکالا تھا۔ لیکن ابن الہیثم نے اسے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار وہ قطع مخروطات کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

عمر خیام اپنے عہد کا دنیا کا سب سے بڑا ریاضی دان گزرا ہے۔

سارٹن ان کے بارے میں لکھتا ہے:

"ان کی سرگرمی الجبرا میں مسلمانوں کی مساعی جمیلہ کے منتہائے کمال کی علامت ہے۔ انہوں نے مساواتوں کی بہت ہی قابل ذکر درجہ بندی کی۔ مثلاً انہوں نے مکعب مساواتوں کی تیرہ صورتوں کو شناخت کیا اور ان سب کو حل کرنے یک کوشش کی اور اکثر مساواتوں کے جزوی ہندسی حل بھی نکالے"۔[29]

---

[29] Introduction to the History of Science,Vol,1,P:740

13.3- علم الہندسہ

علم الہندسہ ریاضیات کے اس علم کا نام ہے جسے جیو میٹری (Geometry) کہتے ہیں اس علم میں مسلمانوں کا تخلیقی کام مامون الرشید کے عہد سے شروع ہوا اس دور میں بغداد میں موسیٰ ابن شاکر کے تینوں بیٹوں محمد، احمد، حسن (جو بنو موسیٰ کے نام سے مشہور ہیں) نے اس فن پر کتابیں لکھیں ان میں سب سے اہم تصنیف "كتاب معرفه المساحت الاشكال البيسط والكريه" ہے جس میں جیو میٹری کے مسائل پر خالص ہندسی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ ریاضی کی دنیا میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں رقبہ اور حجم نکالنے کا یونانی قاعدہ دائرے اور کرے کی پیمائش کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کتاب میں دائرے اور کرے کی پیمائش سے متعلق بعض ایسے ثبوت پیش کئے گئے جو بالکل جدید تھے۔ مصنفین نے کتاب میں جن مسئلوں پر بحث کی ہے ان میں دائرے کا رقبہ معلوم کرنا جب اس کے اضلاع معلوم ہوں، مخروط اور مخروط مقطوع کی سطح کا رقبہ معلوم کرنا، کرے کی سطح کا رقبہ اور اس کی جسامت معلوم کرنا، دو واسطہ متناسبات کا تعین اور زاویے کی تثلیث وغیرہ شامل ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ موسیٰ نے مساحت مخروطات اور دوسرے مسائل پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔

عہد عباسی کے مشہور مہندس ثابت بن قرہ تھے اور انہوں نے جیو میٹری کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان کی تصانیف میں سب سے اہم کتاب ''المفروضات'' ہے۔ انہوں نے جیو میٹری کی کچھ اشکال کے بارے میں نئے کلیات دریافت کئے۔ اعداد متحابہ (Amicable Numbers) کے نظریئے کی اصلاح کی اور اس کے لئے کلیہ بنایا۔ انہوں نے پیرابولا (Parabola) اور پیرالائڈ (Paraboloid) کی مساحت کا قابل ذکر کارنامہ انجام دیا۔

علم الہندسہ کے فروغ میں ابو سہل ویجن بن رستم الکوہی کے نام سے مشہور ہیں۔ نے ناقابل فراموش حصہ ادا کیا ہے ان کی تصنیف "رسالة فى البركارالتام" پہلی کتاب ہے جس میں مخروطی پرکار کا تذکرہ آیا ہے اس پرکار کی ایک ٹانگ کو مخروطی تراشے بنانے کے لئے چھوٹا بڑا کیا جاسکتا ہے۔ منصف نے کتاب میں اس پرکار کے ذریعے سیدھی لائنوں، دائروں اور مخروطی تراشیوں کی دس رانگ کے طریقے بیان کئے ہیں۔ القوھی نے جیومیٹری کے ایسے مسائل کو حل کیا ہے جو دو درجی یا اس سے زیادہ درجوں کی مساواتوں میں تحویل لئے جاسکتے ہیں۔

ابوالوفا بوزجانی نے پرکار کے ایک ہی پھیلاؤ سے ہندسی مسائل کو حل کیا ہے ان کی خدمات کے بارے میں سارٹن لکھتے ہیں:

"پرکار کے ایک ہی پھیلاؤ سے ہندسی مسائل کا حل نکالنا، ایسے مربع کی تشکیل جس کا رقبہ دیئے گئے مربعوں کے رقبے کے مجموعے کے برابر ہو، منتظم کثیر الاضلاع کی ساخت، متساوی الاضلاع مسبع کی تخمینی تشکیل (جس میں اسی دائرے میں محصور ایک متساوی الاضلاع مثلث کے ایک طرف کا نصف استعمال ہوتا ہے) نقاط کی مدد سے قطع مکافی کی تشکیل $x^4=a$ اور $x^4+ax^3=b$ کو ہندسی طریقے سے حل کرنا ان کے کارنامے ہیں"۔

اسی طرح ابن الہیثم عمر خیام نصیر الدین طوسی اور شمس الدین سمرقندی نے جیومیٹری کے علم میں قابل فخر اضافے کیے۔

خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 1: تسخیر کائنات کے بارے میں قرآن مجید میں بیان کردہ آیات کو جمع کیجے اور ان کی روشنی میں سائنسی علوم کی اہمیت بیان کیجیے۔

سوال نمبر 2: علم طب میں ابو بکر رازی، ابن سینا، ابو القاسم الزہراوی کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر 3: اسلام سے قبل علم فلکیات کا تصور کیا تھا اور مسلمانوں نے اس علم میں کیا اضافے کیے؟

سوال نمبر 4: علم ریاضیات میں مسلمان ریاضی دانوں کے کارناموں پر مفصل بحث کیجیے۔

14- علم کیمیا (Chemistry)

مسلمانوں میں علم کیمیا کا آغاز عہد بنو امیہ کے دوران پہلی صدی ہجری میں ہوا۔ عرب میں سب سے پہلے خالد بن یزید (85ھ) نے اس علم میں مہارت حاصل کی۔ انہوں نے اس فن کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس موضوع پر انہوں نے چار کتابیں:

1. "كتاب الحرارت"
2. "كتاب الصحيفة الكبير"
3. "كتاب الصحيفة الصغير"

4. "کتاب وصیة الی ابنه فی الصنعة" تحریر کیں۔

مسلمانوں میں علم کیمیا کا پہلا باقاعدہ عالم جابر بن حیان (184ھ) تھا جسے اس علم کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ جابر نے علم کیمیا میں ستر رسائل تحریر کئے۔

علم کیمیا میں تجرباتی اعمال کی روایت کے بانی جابر بن حیان تھے۔ جابر نے کیمیائی تجربوں کا آغاز کر کے حقیقی معنوں میں جدید کیمسٹری کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے تحلیل (Solution) تقطیر، تبخیر، کشید، تبلیر، تکلیس، تصعید جیسے عملوں کو فروغ دیا۔ ان میں سے بعض تجرباتی اعمال مثلاً تکلیس (Calcination) آکسائیڈ (Oxidation) اور تحلیل (Solution) وغیرہ خود ان کی اپنی دریافتیں ہیں۔ انہوں نے ان تمام کیمیائی عملوں کو اپنی لیبارٹری میں برتا جو عہد وسطی سے لے کر آج تک استعمال ہوتے رہے ہیں۔

جابر نے سلفائیڈ (Sulphide) سے سفیدہ (Lead Carbonate) سنکھیا (Arsenic) اور کحل حاصل کرنے کے طریقے بتائے۔ انہوں نے نباتاتی تیزابوں مثلاً تیزاب لیموں، تیزاب سرکہ اور تیزاب طرطیز کے متعلق اہم معلومات فراہم کیں۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ ان تین معدنی تیزابوں کی دریافت ہے جو انہوں نے قرع انبیق کی مدد سے تیار کئے۔ وہ تیزاب یہ ہیں:

1. پھٹکری، ہیرا کسیس اور قلمی شورے سے شورے کا تیزاب
2. پھٹکری اور ہیرا کسیس سے گندھک کا تیزاب جسے وہ گندھک کا تیل کہتے تھے
3. پھٹکری، ہیرا کسیس، قلمی شورے اور نوشادر سے ماء الملوک جو آج بھی اپنے لاطینی ترجمے (Acqua Regia) کی صورت میں استعمال ہے۔ نوشادر یا امونیم کلورائیڈ سے یونانی واقف نہیں تھے۔ یہ جابر کی دریافت ہے اور وہی پہلے مصنف ہیں جن کی کتاب میں اس کا ذکر آیا ہے۔

جابر بن حیات نے کیمیا کے صنعتی استعمال میں بھی دنیا کی رہنمائی کی ہے۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں فولاد سازی فلزات کی صفائی، لوہے کی زنگ کی حفاظت، چمڑے کی رنگائی، شیشے کو رنگین بنانا، دھاتوں کے مرکبات تیار کرنے، لوہے اور پر وارنش کرنے، بالوں کے لئے خضاب تیار کرنے اور موم جامہ تیار کرنے کے طریقے بیان کئے۔ ان کے علاوہ ان کی کتابوں میں بیسیوں مفید اشیاء تیار کرنے کے طریقے بھی بیان کئے گئے ہیں۔

جابر کے بعد یعقوب کندی نے اپنی تصانیف میں فولاد سازی، عطر سازی اور رنگ سازی پر بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ مسلمان سائنس دانوں کی ان صنعتی خدمات سے نباتات سے عطر بنانے، شیشہ سازی، روغن سازی اور روشنائی کی کئی قسمیں تیار کرنے کی صنعت کو ترقی ہوئی۔

اطباء میں سب سے بڑے کیمیادان ابو بکر رازی تھے۔ انہوں نے اپنے تمام کیمیائی عملوں کو عام فہم زبان میں بیان کیا اور کیمیائی مادوں کو جمادات، نباتات اور حیوانات میں تقسیم کر کے علم کیمیا کی ترقی کے لئے راہ ہموار کی۔

خلاصہ بحث یہ کہ مسلمانوں نے کیمسٹری کے میدا ن میں جو خدمات انجام دیں ان کا اجمال یہ ہے:

1. تجربی تحقیق اور ریاضیاتی تجزیہ کو ملا کر جدید کیمسٹری کی بنیاد رکھی۔
2. تجربی عملوں کو رواج دیا۔

"Filtration, Evaporation, Caicination, Sublimation Solution, Putrefation, Oxidation, Crystallization, Beaching Reddening Melting".

یعنی ترشیح، تبخیر، تقطیر، تکلیس، تصعید، تحلیل، تعفین، آکسائیڈیشن، تبلیر، تبئید، تحمیر، اور تشمیع وغیرہ سے دنیا کو روشناس کیا۔

3. تجربی عملوں کے لئے آلات تیار کئے۔ ابو بکر رازی نے پچیس ایسے آلات کا ذکر کیا ہے جو کیمیائی عملوں کے دوران استعمال ہوتے ہیں۔ مغربی زبانوں میں alembic اور aludel مسلمانوں ہی کی یادگاریں ہیں، جو بالترتیب عربی الفاظ "الانبیق" اور "الانحال" سے ماخوذ ہیں۔ ان کے علاوہ لاطینی زبان میں متعدد الفاظ موجود ہیں۔
4. مسلمانوں نے کھار اور تیزاب الگ الگ کر کے ان میں فرق کیا، انہوں نے نباتاتی اور معدنیاتی تیزاب تیار کئے۔

Arsenic sulphide, Lead Carbonate, Chloric Acid, Itric Acid, Animonisulphide, Silsic Acid, Antimony, Phosphorus, Mercury Oxide, Mercury Chloride, Sodium Carbonate Nitrate of Silver, Sulphuric Acid, Potassiam Nitre.

جیسے مرکبات دریافت اور تیار کئے۔ انہوں نے تانبے اور سیسے کے مرکبات کے زہریلے اثرات اور ان بجھے چونے میں بال دور کرنے کی خاصیت کا پتہ لگایا۔

5. مرکبات کو ادویہ میں استعمال کیا۔ سمیات کو بھی حیات بخش ادویہ میں تبدیل کیا۔

6. مسلمانوں نے سائنسی بنیادوں پر معدنیات کی درجہ بندی کی۔ سب سے پہلے ابو بکر رازی نے کیمیائی مادوں کو جمادات اور حیوانات میں تقسیم کرکے فنی روایت قائم کی۔ معدنیات کو انہوں نے ارواح ، اجسام ، احجار، تیزابات، سہاگوں اور نمکیات میں بانٹ دیا۔ انہوں نے طیران پذیر (Volatite) اجسام اور غیر طیران پذیر ارواح میں فرق کیا۔ موخر الذکر میں انہوں نے گندھک، پارہ، سنکھیا اور salmiac شامل کئے۔

7. مسلمانوں نے ایسی چیزیں ایجاد کیں، جن سے صنعت و حرفت کو بے حد فروغ ملا۔ جابر بن حیات نے ایسا کاغذ ایجاد کیا جسے آگ نہیں جلا سکتی تھی۔ لوہے کے زنگ سے ایسی روشنائی تیار کی جس سے لکھے گئے شاہی فرامین رات کی تاریکی میں پڑھے جا سکتے تھے نیز انہوں نے ایسے وارنش تیار کئے جس سے کپڑا بھیگنے سے لکڑی جلنے سے اور لوہا زنگ لگنے سے محفوظ رہتا تھا۔ جابر ہی نے ایسا پتھر ایجاد کیا جس سے زخموں کو خشک کرنے اور فاسد عضلات کو داغنے کا کام لیا جاتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ماءالملوک جیسا طاقتور تیزاب دریافت کیا جو سونے کو بھی پگھلا دیتا ہے۔

15- علم طبعیات (Physics)

مسلمانوں نے سائنس کے دیگر شعبوں کی طرح طبعیات میں بھی قابل فخر علمی سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہیں ابو یوسف یعقوب کندی پہلے مسلمان سائنس دان ہیں جنہوں نے نظری طبعیات میں تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس موضوع پر چوالیس چھوٹے بڑے رسالے تحریر کئے جن میں فزکس کی مختلف شاخوں پر بحث کی گئی ہے۔ ول دوران کے بقول:

> "انہوں نے موجوں کا مطالعہ کیا، گرتے اجسام کی رفتار متعین کرنے والے قوانین کا پتہ چلایا اور بصریات کے موضوع پر اپنی کتاب میں نور کے مظاہرے پر تحقیق کی"۔[30]

کندی نے فزکس کے مختلف عنوانات پر قلم اٹھا کر بحث کے دروازے کھول دیئے۔ وہ پہلے مسلمان سائنس

---

[30] The Age of Faith,P:251

دان ہیں جنہوں نے موسیقی پر سائنسی انداز میں نگاہ ڈالی اور کہا کہ نغمہ سروں کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ سر کی آواز سے ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں اور یہ لہریں جب کان سے ٹکراتی ہیں تو آواز کا احساس ہوتا ہے۔ ہر سر کے لئے ایک سکینڈ میں پیدا ہونے والی لہروں کی تعداد مقرر ہے، جسے اس سر کی تکرار (Frequency) کہتے ہیں اسی سے سر کا درجہ (Pitch) متعین ہوتا ہے جس سر کی تکرار زیادہ ہوتی ہے اس کا درجہ اونچا ہوتا ہے اور آواز تیز ہوتی ہے۔ کم تکرار والے سر کا درجہ نیچا ہوتا ہے اور وہ آواز بھاری ہوتی ہے۔

طبعیات کے ماہرین میں دوسرا بڑا نام ابو بکر رازی کا ہے۔ انہوں نے فزکس کے عنوانات، مادہ، حرکت، مکان، زمان، مناظر و بصریات پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ رازی نے ارسطو کے نظریات سے اختلاف کیا ہے اور یہ نظریہ پیش کیا کہ مادہ جوہروں سے بنا ہے۔ یہ جوہر مختلف تعداد اور طرز میں مل کر عناصر کو تشکیل دیتے ہیں انہوں نے مختلف چیزوں کی باہمی کشش اور کشش ثقل کو اپنی کتابوں میں موضوع بحث بنایا ہے وہ پہلے سائنس دان ہیں۔ جنہوں نے انکشاف کیا کہ زمین باہمی کشش کے سہارے فضا میں معلق ہے۔

ابن سینا ایک عظیم فلسفی اور طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے ماہر طبعیات بھی تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی فزکس کے تمام موضعات پر تحقیق کی ہے انہوں نے طبیعات میں اجسام طبعی کے لاحقات حرکت، سکون، زمان، کان، خلاء تناہی، تمام، التام اور اتصال پر ماہرانہ بحثیں کیں اور ثابت کیا کہ روشنی کی رفتار خواہ کتنی بھی ہو ہمیشہ محدود ہوتی ہے ان کا کہنا ہے کہ ادراک نور کا سبب اگر مرکز نور سے ذرات کا اصدار ہے تو نور کی رفتار متناہی رہے گی۔ ابن سینا نے وزن مخصوص پر بھی بحث کی ہے۔

فزکس کا موضوع البیرونی کی توجہ کا بھی مرکز رہا ہے۔ انہوں نے روشنی کے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار کے مقابلے میں تیز ہوتی ہے۔ البیرونی نے پانی کو موضوع تحقیق بنایا اور فوارے میں پانی چڑھ آنے، سطح آب کے ہموار ہونے اور گہرائی کے ساتھ ساتھ پانی کے دباؤ میں اضافہ ہونے کی سائنسی توجیہات پیش کر کے ماسکونیات (Hydrostatisties) کی بنیاد ڈالی۔

فزکس کے ارتقاء میں ھبۃ اللہ بن علی (547ھ) جو البرکات بغدادی کے نام سے مشہور ہیں نے قابل رشک کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف "کتاب المعتبر" میں قیاس و تخمین کو رد کر کے مشاہدے اور تجربے پر زور دیتے ہوئے فزکس کے مختلف عنوانات پر تحقیق کی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے متحرک اشیاء کی حرکت پر بحث

کرتے ہوئے اس قانون کی طرف رہنمائی کی جو حرکیات (Dynamics) کا بنیادی اصول مانا جاتا ہے۔

15.1 - حرکیات

فزکس میں حرکیات (Dynamics) کا موضوع بھی مسلمانوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ یونانیوں میں اس موضوع پر ارسطو کا نظریہ افکار کی دنیا میں بڑا اہم مانا جاتا تھا جس کے مطابق پھینکے جانے والے پتھر کی سامنے والی ہوا ہٹ کر پتھر کے پیچھے آتی ہے اور وہ پتھر کو آگے دھکیلتی ہے۔ مسلمان سائنس دانوں نے ارسطو پر تنقید کر کے اس نظریئے کو رد کر دیا۔

حرکت کے موضوع پر ابن سینا نے بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ کسی متحرک جسم کا متحرک ہونا اس کی فطرت کا تقاضا نہیں ہے کیونکہ حرکت ایک ایسی خاصیت ہے جو جسم کو بگاڑے بغیر ایک متحرک جسم سے الگ کی جا سکتی ہے اس لئے ایک متحرک جسم فطری حالت میں نہیں ہوتا بلکہ وہ فطری حالت میں لوٹنا یا سکون کی حالت میں آنا چاہتا ہے۔ فطری حالت سے حرکت میں آنے کے لیے زبردست عامل ہونا لازمی ہے۔ اس لئے وہ حرکات جو عامل کے بغیر صرف فطری تقاضے نمودار ہوں حقیقتاً ایک ناگوار حالت، جس میں وہ جسم پڑ گیا ہے، فرار کی نوعیت کی ہوتی ہے ایک جسم جو فطری حالت میں یا فطری مقام میں نہیں ہوتا ہے وہ میلان طبیعی کے باعث سب سے چھوٹا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے اس لئے خط مستقیم میں حرکت کرتا ہے وہ حرکت جو دائرہ میں ہوتی ہے اس کا منبع ایک روح ہوتی ہے۔ یعنی ایک ایسی قوت جو اپنے ارادے اور اختیار سے کام کر رہی ہوتی ہے۔ ستاروں کی حرکت جو دائرہ میں ہوتی ہے وہ بھی روح کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حرکت مدورہ کبھی شدید نہیں ہوتی۔

ابن سینا کے نظریات ابوالبرکات بغدادی نے قدرے ترمیم کے ساتھ قبول کئے۔ ان کے مطابق حرکت کی علت اشیاء کا شدید میلان (violent lnclination) ہے یعنی وہ قوت جسے پیش انداز یا پھینکنے والا جسم، پھینکے جانے والے جسم کو تفویض کرتا ہے۔ ابوالبرکات نے جس چیز کو شدید میلان کا نام دیا ہے اس کے لئے مغربی سائنسدانوں نے بعد میں قوت محرکہ (Impetus) کا نام استعمال کیا۔

اندلس میں ابوالبرکات کے ہم خیال مشہور فلسفی ابن باجہ تھے انہوں نے حرکیات کے بارے میں جو افکار پیش کئے ان سے یورپ والے متاثر ہوئے۔ اہل یورپ کو ''ابن باجہ حرکیات'' کا علم ابن رشد کی تحریروں سے

ہوا۔ ابن رشد نے اگرچہ ابن باجہ کا نظریہ رد کر دیا تھا مگر تھامس اکویناس (Thomas Aquinas) ڈنس سکوٹس(Duns Scouts) اور اسکولی (Schoolmen) اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ گلیلیو نے اپنی تصنیف میں ابن باجہ کے نظریے کی بنیاد پر ارسطو کے نظریئے کو مسترد کر دیا تھا۔

مسلم سائنسدانوں نے (Momentum)پر بھی توجہ دی ہے۔ ابن الہیثم نے اپنی تصنیف "کتاب المناظر" میں معیار حرکت (Momentum) کو قوت الحرکت کہا ہے۔ انہوں نے حرکت کے موضوع کا مطالعہ کیا نیز خلاء اور مکان کا تصور اسی انداز سے پیش کیا جو سترھویں صدی کے علمائے طبعیات نے حرکیات مرتب کرتے وقت اختیار کیا تھا۔

گزشتہ صفحات میں آپ نے مطالعہ کیا ہو گا کہ ابو بکر رازی نے کشش ثقل کا نظریہ پیش کیا انہوں نے ایک تصنیف "کتاب سبب وقوف الارض فی السماء" کے عنوان سے تحریر کی جس میں انہوں نے بتایا کہ زمین کشش کے سہارے فضاء میں معلق ہے کشش ثقل کا موضوع جن دوسرے مسلمان علماء کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے ان میں ابن سینا ابو البرکات بغدادی اور ابن مسکویہ بھی شامل ہیں موخر الذکر نے ابو معشر بلخی کے بعد مدوجزر کا مطالعہ کر کے بتایا کہ اس کا اصل سبب چاند کی کشش ہے۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ سیارے سورج کی کشش کی بنا پر اس کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ مسلم علماء اس امر سے واقف تھے کہ گرتے ہوئے اجسام کی اسراع کا تعلق ان کی کمیت سے نہیں ہوتا نیز وہ اس سے بھی آگاہ تھے کہ دو جسموں کے درمیان قوت کشش اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ان کا باہمی فاصلہ کم ہوتا ہے۔

15.2-بصریات

فزکس میں بصریات کا میدان بھی مسلمانوں کی سائنسی سرگرمیوں کا نتیجہ عروج رہا ہے کندی ابن سینا اور البیرونی جیسے نامور سائنسدانوں نے اسے موضوع بحث بنایا ہے لیکن ان میں ماہر بصریات کی حیثیت سے سب سے زیادہ شہرت ابن الہیثم کو ملی۔ انہوں نے طبیعات پر چوالیس کتابیں تصنیف کیں جن میں "کتاب المناظر" کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔

ابن الہیثم نے آئینوں اور نور سے متعلق کئی اہم حقائق دریافت کئے ہیں۔ ان کی ایک تحریر "المرایا

المحرقه" کے نام سے معروف ہے جس میں انہوں نے انعطاف کو ناپنے کے لئے ایسی وحدت (Dioptric) پیدا کی ہے جو یونانیوں کی دریافت سے بہت بہتر ہے انہوں نے تمسیک (Focussing) تکبیر (Magnifying) تقلیب تمثال (Inversion of images) اور رنگوں کی تشکیل کے بارے میں تجربات کی بنیاد پر دقیق اور درست تصورات پیش کئے ہیں۔ آئینوں کے موضوع پر اپنی تحریروں "مقاله فی المرایا المحرقة بالدوائر" اور "مقاله فی المرایا المحرقة بالقطوع" میں انہوں نے کردی مقعر اور مکانی آئینوں کے متعلق جو حقائق دریافت کئے ہیں وہ مصنف کے شاندار کارناموں سے شمار ہوتے ہیں۔

ابن الہیثم پہلے سائنسدان ہیں جنہوں نے کیمرہ مظلمہ (camera obscura) کا اصول دریافت کر کے اسے استعمال کیا ہے اس کا بیان ان کی تصنیف "مقاله فی صورة الکسوف" میں موجود ہے۔ انہوں نے اس کے لئے "البیت المظلم" کا نام اختیار کیا ہے۔ (Camera Obscura) اسی کا لاطینی ترجمہ ہے۔ ابن الہیثم نے کھڑکی کے کواڑ میں ایک چھوٹا سا سوراخ بنا کر گرہن کے دوران سورج کا نیم قمری عکس مقابل کی دیوار پر مشاہدہ کیا انہوں نے سورج کے اس نیم قمری عکس کی سائنسی توجیہ بیان کی اور اس کی شرائط پر روشنی ڈالی۔ میکس میر باف اور سارٹن کا بیان ہے کہ یہ کیمرہ مظلمہ کا سب سے پہلا استعمال ہے۔

ابن الہیثم نے سوراخ دار یا سوئی چھید کیمرے (Pinhole) کا اصول بھی دریافت کیا۔ اسے انہوں نے ثقبالہ کا نام دیا ہے۔ انہوں نے تجربے سے ثابت کیا کہ اگر کسی تاریک خانے میں تنگ سوراخ ہو اور اس کے سامنے کوئی منور جسم ہو تو اس جسم کا عکس تاریک خانے کے اندر کے پردے پر الٹا ہو گا اور اگر سورخ کے سامنے کئی منور جسم (مثلاً موم بتیاں) ہوں گی تو نہ صرف ان کے عکس ہی الٹے ہوں گے بلکہ داہنی طرف کے جسموں کے عکس پردے پر بائیں طرف نظر آئیں گے۔

ابن الہیثم نے روشنی کے بارے میں کئی قوانین دریافت کئے اور تجربوں سے ان کے ثبوت فراہم کئے۔ ان میں سے دو قوانین جو آج بھی تسلیم کئے جاتے ہیں یہ ہیں:

1. شعاع واقع، عمودی خط اور شعاع منعکس تینوں ایک ہی سطح میں پائے جاتے ہیں۔
2. شعاع واقع اور شعاع منعکس عمودی خط کے ساتھ مساوی زاویے بناتے ہیں۔

علامہ قطب الدین شیرازی (710ھ) کی خدمات طبعیات میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی

کتاب "نهایه الادراک فی درایة الافلاک" میں بصریات پر کئی فصلوں میں بحث کی ہے جس میں انہوں نے رویت کی خاصیت اور قوس قزح کے رنگوں کی تشکیل کی توجیہ بیان کی ہے۔ وہ پہلے سائنسدان ہیں جنہوں نے یہ صحیح انکشاف کیا کہ پہلی قوس قزحمیں آویزاں چھوٹے چھوٹے پانی کے گول قطروں میں سورج کی کرنوں کے دو انعطافوں اور ایک اندرونی انعکاس سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری قوس دو انعطافوں اور دو داخلی انعکاسوں سے وجود میں آتی ہے۔

15.3- علم جر ثقیل (Mechanics)

علم جر ثقیل یا میکانیکا (Mechanics) میں بھی مسلمانوں نے اپنی اختراعی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب احمد بن موسی نے کتاب الحیل کے عنوان سے 860ء کے آس پاس تحریر کی ہے۔ منصف نے اس میں ایک سو اوزاروں اور مشینوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے بیشتر خود ان کی اپنی ایجادیں ہیں۔ اس کتاب میں ایسے سائنسی کھلونوں کا بیان ہے جن کا حال پڑھ کر حیرت ہوتی ہے نیز پانی پینے کے لئے ایسے خود کار برتنوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے پانی پیتے وقت موسیقی کی آوازیں آتی تھیں۔

عراق اور مصر میں آلیات کے موضع پر بعد کے ادوار میں کئی کتابیں تحریر کی گئیں جن میں آب رسانی اور ذرائع آب پاشی کے لئے مختلف آلات کی تفصیل ملتی ہے۔ آبی گھڑیاں، پانی کو اوپر لے جانے والی مشینیں اور رہٹ بنانے میں مسلم ماہرین نے ان کتابوں میں بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے بعض مصور مخلوطات میں ایسی ماسکونی کلوں کے تذکرے کر دیئے گئے ہیں جو اپنی، پارے، وزن اور جلتی ہوئی موم بتیوں کی مدد سے حرکت کرتی تھیں۔

آب رسانی کے لئے مسلمان نے جس فنی مہارت کو بروئے کار لائے اس کے نتیجے میں کئی مشینیں وجود میں آئیں ان میں سب سے ترقی یافتہ مشین نعورا (Naura) تھی جو پانی سے چلتی تھی یہ مشین کسی دریا یا جھیل کے اپنی کو بلندی پر لے جا کر ایک حوض میں گرا دیتی تھی جہاں سے یہ شہر کو پختہ نالیوں اور نہروں میں چلا جاتا تھا جس سے شہریوں کی ضروریات پوری ہونے کے ساتھ ساتھ کھیتوں کی آبپاشی بھی ہوتی تھی۔

فن سپہ گری کے موضوع پر ازمنہ وسطی کے مسلمانوں نے پچاس سے زائد تصانیف تحریر کی ہیں جن میں شہ سواری، نیزہ بازی اور جنگی حکمت عملی جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ روایتی اسلحوں میں مسلمان تلوار، نیزے، تیر

اور ڈھال استعمال کرتے تھے منجنیق کا استعمال پہلی صدی ہجری کے دوران ہوا یہ بیرم سے چلنے والی مشین تھی جس کے ذریعے وزنی پتھر پھینک کر دشمن کے قلعے کی دیوار کو گرایا جاتا تھا یا محصور فوج محاصرین پر سنگ اندازی کرتی تھی۔ عباسیوں نے اسے مزید ترقی دی چھٹی صدی ہجری میں مسلمانوں نے ایک طاقتور قسم کی منجنیق ایجاد کی جس میں دو کوئینٹل سے زائد وزنی پتھر پھینکنے کی صلاحیت تھی۔ منجنیق کو بہتر شکل دینے کے علاوہ مسلمانوں نے اس کے دائرہ کار میں بھی وسعت پیدا کی اور اس کے ذریعے آتش گیر مادے اور دھماکہ خیز اسلحے پھینکے جانے لگے۔

آتشیں اسلحوں میں ایک قابل ذکر قسم سہم تھی جس میں پرواز کرنے اور خلاف کو ہدف بنانے کی صلاحیت ہوتی تھی یہ ایک قسم کا راکٹ تھا جس میں بارود بھر دیا جاتا تھا پھر اس کے فیتے کو سلگا کر دشمن پر چھوڑ دیا جاتا تھا اس کی ایک قسم سہم ساعی (دوڑنے والا تیر) تھی جس میں دو طرفہ دیدبان ہوتے تھے یہ دشمن کی فوجوں میں پہنچ کر آتشیں مادے کو خارج کرتا تھا اور پھر اس جگہ واپس بھی آتا تھا جہاں سے اسے چھوڑا گیا تھا۔ ازمنہ وسطی کے ان راکٹوں میں ایک قسم فتاش کے نام سے موسوم تھی جس پر کاغذ یا چمڑے کے پنکھ ہوتے تھے اور اسے پتنگ کی طرح اڑایا جاتا تھا۔ اس میں قلعوں اور جہازوں پر گرانے کے لئے آتشیں مادے بھرے ہوتے تھے۔

آتشیں اسلحوں میں پانی کی سطح پر تیرنے والا ایک تارپیڈو بھی قابل ذکر ہے۔ یہ لوہے کی چادر کا بنا ہوتا تھا۔ اس کی شکل ناشپاتی سے ملتی جلتی تھی۔ پیچھے نلکیاں لگی ہوتی تھیں۔ برتن میں بارود اور آتش گیر مادہ ہوتا تھا۔ برتن کے سامنے کی طرف اور نلکیوں میں آگ لگا کر اسے نشانہ کی طرف دھکیل دیا جاتا تھا۔

حربی فنون میں مسلمانوں کی سب سے اہم ایجاد توپ ہے۔ اسپین کے مورخ کونڈ (Conde) کا بیان ہے کہ الموحدین میں خلیفہ الناصر نے 601ھ/1204ء میں شمالی افریقہ میں ایک باغی سردار کے شہور المہدیہ کا محاصرہ کیا اور دیواروں پر مختلف آلات اور گرجنے والی کلوں کے ذریعے سے جن کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا حملہ کیا تھا اور ان کلوں میں سے سو سو دھاریں نکلی رہی تھیں اور شہر میں بڑے بڑے پتھر اور آگ کے گولے برس رہے تھے۔

الفانسو یازدہم کی تاریخ میں لکھا ہے کہ الجسر شہر پر مسلمان فوج نے بہت سی گرجنے والی چیزیں اور لوہے کے گولے بہت بڑے سیب کے برابر پھینکے تھے یہ گولے اس قدر دور جاتے تھے کہ بعض فوج کے اس پار ہو جاتے تھے اور بعض فوج میں گرتے تھے۔ دو انگریز کاونٹ ڈربی اور سالسبری محاصرے کے وقت موجود تھے انہوں نے بارود کے اس نئے استعمال کو دیکھا اور اس ایجاد کو اپنے ملک میں لے گئے اور اسی وجہ سے چار سال بعد انگریزوں نے کریسی کی لڑائی

(1346ء) میں توپ کا استعمال کیا۔

گھڑی سازی کے ساتھ مسلمانوں کو خاص شغف رہا ہے۔ سب سے پہلی گھڑی کا ذکر ہارون الرشید کے عہد میں آیا ہے۔ انہوں نے فرانس کے بادشاہ شارلیمان (678-814ء) کو جو تحفے بھیجے تھے ان میں ایک گھڑی بھی تھی جس سے بجنے والی آواز آتی تھی۔ شارلیمان کے درباری اسے دیکھ کر مبہوت ہو گئے تھے۔

عہد عباسی میں محمد بن موسیٰ الفرغانی نے سب سے پہلے دھوپ گھڑی بنائی اس کے بعد ان گھڑیوں کا رواج عام ہوا۔ پانچویں صدی ہجری میں اندلس کے ماہر فلکیات ابو اسحاق ابراہیم الزقانی نے طلیطلہ میں دریاء طاغوس کے کناروں پر دو آبی گھڑیال بنائے جس میں قمری تقویم کے اصول کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ گھڑیال میں دو برتن تھے جو چاند کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ ساتھ تدریجاً بھرتے اور خالی ہوتے جا رہے تھے۔ پلرمو میں مسلمانوں نے ایک چشمے پر گھڑیال بنایا جو نماز کے وقتوں پر بجتا تھا اور اس کی آواز کئی میلوں تک سنائی دیتی تھی۔

عام رائے یہ ہے کہ مسلمانوں نے شمسی اور آبی گھڑیال بنائے تھے لیکن مغرب کے بعض فلاحوں کا بیان ہے کہ انہوں نے لنگر دار گھڑیال بھی بنائے۔ آکسفورڈ کے ڈاکٹر برناڈو کا قول ہے کہ لنگر کا استعمال گھڑیوں میں سب سے پہلے عربوں ہی نے کیا ہے۔ ڈربیر کا کہنا ہے کہ پنڈولم سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے ایجاد کیا ہے۔ موسیو سید یو کا بیان ہے کہ سوراخ دار ربع اور بجنے والی گھڑی کا پنڈولم ابن یونس نے ایجاد کیا ہے۔

میزان سازی اور اوزان میں مسلمانوں نے دوسری قسموں کی بہ نسبت زیادہ توجہ دی ہے۔ سب سے پہلے محمد بن موسیٰ بن شاکر نے ایک کیمیاوی ترازو ایجاد کیا جس سے کم سے کم مقدار کا صحیح وزن دریافت کیا جاتا تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں ثابت بن فرہ نے ڈنڈی دار ترازو کے موضع پر "کتاب فی القرسطون" کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی جس میں انہوں نے بیرم کے اصول توازن پر بحث کی۔ مامون الرشید کے دور میں اس موضوع پر سند بن علی کا کام معروف ہے۔ اسی زمانے میں دریائے نیل کی طغیانی ماپنے کے لیے الفرغانی نے "مقیاس النیل" بنایا جسے آج بھی (Nilometer) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد البرونی نے دھاتوں، پتھروں اور مائعات کی کثافت معلوم کرنے کے لئے کئی ترازو ایجاد کئے جن کی مدد سے انہوں نے آٹھ دھاتوں قیمتی پتھروں سمیت پندرہ ٹھوس چیزوں اور مائعات کی درست کثافت دریافت کی۔

ماسکونی طریقے کے ذریعے چیزوں کی کثافت معلوم کرنے میں عمر خیام کو بھی دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے ایک

تصنیف"میزان الحکم" میں کسی بھرت میں شامل دھاتوں کے اوزان مخصوص کے تعین پر بحث کی اور اس میں موجود سونے اور چاندی کی مقداریں معلوم کرنے کے لئے ایک الجبرائی طریقہ بھی فراہم کیا۔ اپنی ایک دوسری تصنیف "فی القسطاس المستقیم" میں انہوں نے ایک خاص قسم کے ترازو پر روشنی ڈالی ہے۔ خیام کی دونوں کتابیں ان کے شاگرد ابو حاتم المظفر الاسفرازی کی تحریروں کے ساتھ ایک مجموعے میں شامل تھی یہ مجموعہ بھی میزان الحکم کے نام سے معروف ہے۔

مسلمانوں نے دنیا میں جو ایجادیں کیں ان میں ایک قطب نما ہے۔ بحری ضروریات کے لئے قطب نما کا استعمال سب سے پہلے انہوں نے کیا۔ موسیو سیدیو لکھتے ہیں:

"قطب نما کا استعمال عربوں نے گیارہویں صدی عیسوی میں کیا ہے وہ بحری اور بری دونوں قسم کے سفروں اور نماز کے لئے سمت قبلہ کو راست کر کے محرابیں اور مسجدیں بنانے میں قطب نما سے کام لیتے تھے"۔

مسلمانوں کی دوسری اہم ایجاد بارود ہے جس نے دنیا کے سیاسی نقشے کو بار بار تبدیل کیا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹیکا میں ہے:

"بارود کے متعلق گو عام خیال یہ ہے کہ یہ چین سے آیا ہے جہاں دسویں صدی عیسوی تک اس آتش بازی میں استعمال کیا جاتا تھا لیکن بعض شہادتیں بتاتی ہیں کہ سب سے پہلے عربوں نے بارود بنایا نیز 1304ء تک عربوں ہی نے پہلی بندوق بھی بنائی تھی جو بانس کی نلکی اور لوہے سے بنی تھی اور جس میں تیر پھینکنے کے لئے بارود بھر دیا جاتا تھا"۔

بندوق سازی میں مسلمانوں کی مہارت مسلم تھی عہد مغلیہ میں فتح اللہ شیرازی کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے ایک ایسی بندوق ایجاد کی جو ایک راؤنڈ (Round) میں بارہ فائر کرتی تھی۔

مسلمانوں کی حربی کتابوں میں بارود کے ان گنت نسخے دیئے گئے ہیں۔ نجم الدین ایوب الرماح (المتوفی 694ھ/1294ھ) کی کتاب میں بارود کے ستر نسخوں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ جن میں بارود کی تیار ی کے لیے شورہ کوئلہ اور گندھک کی مقداریں توپ میں بارود بھرنے کے طریقے اور ضروری ہدایات دی گئی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بارود اور توپ انہی کی ایجادات ہیں۔

قطب نما اور بارود کے علاوہ مسلمانوں نے جن نئی چیزوں کو رواج دیا ان میں سب سے اہم کاغذ ہے جو 105ء

چین میں بنایا گیا تھا۔ مگر صدیوں تک چینی حدود میں رہا 70ء میں کاغذ مکہ میں پہنچا جسے غالباً تاجر اپنے ساتھ لائے تھے۔ 712ء میں مسلمانوں نے سمرقند فتح کیا تو چینی قیدیوں کے توسط سے وہ کاغذ سازی کے فن سے آشنا ہوئے۔ 794ء میں ہارون الرشید کے دور خلافت میں فضل برمکی نے بغداد میں کاغذ بنانے کا پہلا کارخانہ قائم کیا۔

مسلمانوں نے کاغذ سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ چینی ریشم اور روئی سے کاغذ تیار کرتے تھے مسلمانوں نے ریشم اور روئی کے علاوہ روئی اور کپاس کے ریشوں سے کاغذت تیار کرنا شروع کیا۔ تہامہ کے ایک کارخانے میں سبزی کے ریشوں سے کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ چین میں کاغذ سازی، دستکاری تک محدود تھی مسلمانوں نے اسے صنعت کی شکل عطا کی۔ بانس کے سانچہ کی ایجاد کاغذ بنانے میں روئی سوت اور کتان کا استعمال کتانی چیتھڑوں کی تخمیر کاغذ کو سخت بنانے کے لئے مسالہ لگانا، بھاری ہتھوڑوں سے چیتھڑوں کی لگدی بنانا اور کاغذ کے کارخانے چلانے کے لئے آبی چکی سے کام لینا مسلمانوں کی جدتیں تھیں۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان طباعت کے عمل سے واقف تھے عبدالرحمان کے ایک منشی سرکاری مراسلات اپنے گھر میں تیار کرتے تھے اس کے بعد ایک کارخانے میں اس کی نقلیں تیار ہوتیں جنہیں مختلف گورنروں کو ارسال کیا جاتا تھا بعض شہادتوں سے معلوم ہوا ہے کہ 1294ء سے قبل تبریز میں بلاک پرنٹنگ کا انتظام موجود تھا۔

18- علم نباتات (Botany)

عہد وسطیٰ کی ہزار سالہ مدت کے دوران مسلمانوں نے حیاتیات (Biology) میں وقیع خدمات انجام دی ہیں حالانکہ اس زمانے میں یوں علم جدید خطوط پر مدون نہیں ہوا تھا۔ آج اس کی ایک شاخ (Botany) کہلاتی ہے۔ مسلم ماہرین کے یہاں دواسازی سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے۔ ہر پودا یا جڑی بوٹی کسی نہ کسی مرض کی دوا ہے۔ اس لئے مسلمانوں نے نباتات کی طبّی افادیت کے پیش نظر اسے "الادویۃ المفردہ" کا نام دیا۔ چنانچہ الادویۃ المفردہ کے عنوان کے ذیل میں نباتات ہی موضوع بحث بنتے ہیں۔

نباتیات پر مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری میں توجہ دی۔ سب سے پہلے جابر بن حیان نے "کتاب الحدود" میں نباتات اور زراعت پر بحث کرنے کی ابتداء کی۔ تقریباً اسی عہد میں عبدالملک اصمعی (312ھ)

نے "كتاب النبات و الأشجار" تصنیف کی جس میں انہوں نے پودوں اور درختوں کے بارے میں تفصیلات قلم بند کیں مگر یہ تینوں عام طور پر غیر معروف ہیں۔ مستشرقین ماہرین نباتیات کے ذیل میں سب سے پہلے مشہور مورخ ابو حنیفہ الدینوری (المتوفی 258ھ) کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے نباتیات کے موضوع پر ''کتاب النبات'' کے نام سے ایک تصنیف لکھی جو صدیوں تک مغربی ماہرین نباتیات بالخصوص مسلم ماہرین زراعت کے لئے اہم ماخذ رہی ہے۔ نباتیات کا موضع رسائل اخوان الصفاء میں بھی زیر بحث آیا ہے۔ اخوان الصاف نے نباتات کی تقسیم اور ان کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے پہلیمر تبہ انکشاف کیا کہ بعض نباتیات میں حس موجود ہوتی ہے۔

اسلامی مشرق کے ماہرین نباتیات میں ابو منصور موفق علی ہروی عظیم محقق کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انہوں نے سالہاسال تک جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دور دراز علاقوں کے سفر کئے۔ اپنے وسیع تجربات اور تحقیقات کو "الابنية عن حقائق الادوية" میں جمع کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے پانچ سو چوراسی دواؤں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جن میں معدنیات سے تیار ہونے والی دوائوں کی تعداد پچھتر حیوانات سے حاصل ہونے والی دواؤں کی چوالیس اور نباتات سے بننے والی دواؤں کی تعداد چھیاسٹھ ہے۔

نباتیات کے میدان میں اطباء نے بھی قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں۔ اگرچہ ان کے یہاں نباتات کا ذکر ادویہ کی حیثیت سے آیا ہے۔ بغداد کے ماہر امراض چشم علی بن عیسٰی (441ھ) نے اپنی کتاب "تذكره الكحالين" میں آنکھ کے علاج میں کام آنے والی ایک سو تینتالیس مفرد دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے نام دیئے ہیں۔ انہوں نے ان پودوں کی پہچان اور ان کے خواص کے متعلق اہم معلومات پیش کی ہیں۔ ان کے ہم عصر مشہور طبیب شیخ بو علی سینا نے اپنی تصنیف "القانون فی الطب" کی دوسری کتاب میں آٹھ سو دواؤں کی تفصیل حروف تہجی کے اعتبار سے دی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ نباتیات کے میدان میں ایک وقیع اضافہ ہے۔ البیرونی نے اپنی کتاب "الصيدلة فی الطب" میں عربی حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق سات سو بیس مقالات کے تحت مفرد دواؤں کی تفصیل بیان کی ہے ان میں پودوں اور جڑی بوٹیوں کی ایک بڑی تعداد بھی زیر بحث آئی ہے۔

علم نباتیات کے حوالے سے مشرق کے مقابلے میں اندلس زیادہ زرخیز ثابت ہوا ہے یہاں کے مسلمانوں نے تاریخی نباتیات میں شاندار اوراق جوڑ دیئے ہیں۔ اسپین کے اولین ماہرین میں نامور طبّی عریب بن سعد الکاتب القرطبّی

(356ھ) کا نام آتا ہے مگر بحیثیت ماہر نباتیات کے ان کی شہرت ان کی طبابت کے سامنے ماند پڑ گئی ہے۔ اسپین کے پہلے مشہور ماہر ابن جلجل (483ھ) ہیں جنہوں نے نہ صرف یونانی ماہر نباتیات دیسقوریدوس کی کتاب کی اصلاح کی اور اس کی عربی شرح تیار کی بلکہ "مقالة فی ذکر الادویة لم یذکرها دیسقوریدوس" کے عنوان سے خود بھی ایک کتاب تحریر کی۔ اس میں انہوں نے ان جڑی بوٹیوں کا ذکر کیا جو دیسقوریدوس کو معلوم نہیں تھیں۔

مفکرین اسلام میں ابن باجہ (235ھ) نباتیات کے ماہر تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی تحریر کیا ہے جغرافیہ دانوں میں ادریسی ماہر نباتیات کی حیثیت سے معروف تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر "الجامع لصفت اشتات النبات" لکھی جس میں تین سو ساٹھ پودوں کی تفصیل دی ہے۔ میکس میرہاف (Max mirhalf) کے بقول ادریسی پودوں کے مترادفات بیان کرنے میں کامیاب ہیں۔ کبھی کبھی وہ بارہ بارہ زبانوں کے مترادفات دیتے ہیں۔ اسپین کے ماہرین نباتیات میں ابو جعفر محمد الغافقی کا نام اپنے کارناموں کی دبولت خاصا مشہور ہے۔ قرطبہ کے اس طبیب نے اسپین اور افریقہ کے پودوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی اور اپنی کتاب "الادویة الفرده" میں ان کی تفصیلی معلومات فراہم کیں۔

انہوں نے ہر پودے کے لاطینی بربری اور عربی نام لکھے نباتیات کی تلاش میں اشبیلیہ کے ایک عالم ابوالعباس (636ھ) نے اٹلانٹک سے لے کر بحرہ قلزم تک کے سفر کئے۔ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دور دراز علاقوں کا سفر کرنے کی وجہ سے ان کا نام ابوالعباس نباتی پڑ گیا۔ انہوں نے اپنے سالہا سال کے تجربات کا نچوڑ "الرحلة النباتية" کے عنوان سے ایک کتاب میں قلم بند کیا۔

نباتیات کے شعبے میں "کتاب الادویة المفرده" کے مصنف رشیدالدین الصوری (639ھ) کی تحقیقات حد درجہ قابل داد ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ہمیشہ ایک مصور رکھتے تھے جس کے پاس قسم قسم کے رنگ ہوتے تھے۔ رشیدالدین جب جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور کوہستانی علاقوں میں جاتے تو پہلے کسی بوٹی کا مشاہدہ کرتے اور اس کی چھان بین کرتے پھر اسے اپنے مصور کو دکھلاتے جو پہلے اس کے رنگ، جڑ، شاخوں اور پتوں کی مقدار کو بغور دیکھتے اور تصویر بناتے۔ پھر ہر ایک چیز کے رنگ کے مطابق اس میں رنگ بھرتے۔ پھر اسی پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ ہر بوٹی کو اس کے مختلف زمانوں میں وقت ظہور، وقت کمال، وقت طراوۃ وقت یبس (تازگی اور خشک ہونے کی حالت) میں

دیکھتے۔اس کے بعد ہر وقت کی تصویر الگ الگ مختلف رنگوں میں بناتے آخر میں اسے کتاب میں شامل کیا جاتا جو "کتاب الادویۃ المفردہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

عہد وسطیٰ کے جس عظیم سائنس دان کو نباتیات کے میدان میں بے پناہ شہرت ملی وہ ابو محمد عبداللہ بن احمد بن البیطار (642ھ) ہیں انہوں نے اس فن پر کئی کتابیں تحریر کیں ہیں جن میں "المغنی فی الادویۃ المفردہ" اور "الجامع المفردات الادویۃ والا غذیۃ" مشہور ہیں۔ آخر الذکر کتاب "الجامع المفردات الادویۃ والا غذیۃ" میں انہوں نے علاج کے لئے چودہ سو دواؤں کی تفصیل دی ہے۔

16.1-علم زراعت

علم نباتیات میں ان مصنفوں کی خدمات بھی کچھ کم اہم نہیں۔ جنہوں نے زراعت (Agronomy) کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ان میں سے بعض نے اس فن میں قابل ذکر تحریری یادگاریں چھوڑی ہیں۔اولین مصنفوں میں بغداد کے ابو بکر احمد بن علی ابن وحشیہ تذکرہ نگاروں کے یہاں عام طور پر معروف ہیں۔انہوں نے اپنی تصنیف "الفلاحۃ النبطیۃ" میں پیڑ ،پودوں،ذرائع آبپاشی ،موسمی حالات، شجر کاری اور دیگر موضوعات پر بحث کی ہے۔ زراعت کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں ابن ممتاتی (التوفی 606ھ) کی تصنیف "قوانین الدواوین" جمال الدین الوطواط (التوفی718ھ) کی کتاب "مباھج الفکر و مناھج العبر" ریاض الدین الغزی العامری، (التوفی934ھ) کی ضائع شدہ کتاب اور عبدالغنی نابلسی (التوفی935ء) کی تصنیف "علم الماحۃ فی علم الفلاحہ" کو زراعتی ادب میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔

قرون وسطیٰ کے دوران سب سے زیادہ شہرت اشبیلیہ کے ابوذکریا یحیی بن محمد ابن العوام الاشبیلی (التوفی 1190ء) کو نصیب ہوئی۔جن کی تصنیف "کتاب الفلاحۃ" اس موضع پر بڑی اہم تحریر تصور کی جاتی ہے۔ابن العوام نے یونانی اور عربی مآخذ سے استفادہ کرنے کے علاوہ اسپین کے معاصر علماء کے اقوال و تجربات سے بھی استشہاد کیا ہے۔"کتاب الفلاحۃ" میں 34 باب ہیں جن میں 585 نباتات کی تفصیل دی گئی ہے اس کے علاوہ اس کتاب میں پچاس سے زائد میوہ دار درختوں کی کاشت کے بارے میں رہنمائی ملتی ہے نیز اس میں درختوں میں پیوند کاری زمین کی

خصوصیات نباتات کو لگنے والی بیماریوں اور ان کے علاج حیوانات کی پرورش نیز مرغیوں اور شہد کی مکھیوں کو پالنے پر بھی بحث کی گئی ہے۔

مسلم ماہرین زراعت کی کتابوں میں اضرابی کی اقسام، کاشتکاری، آلات کی کشاورزی ذرائع آبپاشی پھل دار درختوں کی شجر کاری شاخ تراشی، پیوند کاری، پھلوں اور سبزیوں کی اقسام اور ان کی کاشت مضر اور منافع بخش پودوں اناج اور پھلوں کی ابقاء، مویشی پروری، کھاد اور زراعت سے متعلق دوسری چیزوں پر بحث کی جاتی تھی اسپین کے مسلم ماہرین زراعت کے پاس نباتاتی باغ اور آزمائشی پلاٹ ہوتے تھے جہاں وہ پودوں پر تجربے اور پیوند کاری کر کے پھلوں کی نئی اقسام پیدا کرتے تھے پھلوں اور پھولوں کی نئی نئی قسمیں پیدا ہونے سے خود زراعتی ادب کا دامن اسماء واصطلاحات سے مالا مال ہوا۔ بیسویں صدی میں مصطفیٰ شہابی نے زراعتی لغت تیار کی تو اصطلاحات کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔

مسلمان ماہرین نے پیوند کاری کے ذریعہ پھلوں اور پھولوں کی سینکڑوں نئی قسمیں پیدا کیں۔ نویں صدی کی ایک تصنیف "نزهة الانام فی محاسن الشام" میں شام کی ناشپاتیوں کی اکیس انگوروں کی پچاس اور گلاب وغیرہ کی چھ قسموں کا بیان ہے۔

بارہویں صدی ہجری /اٹھارویں صدی عیسوی میں عثمانی ترکوں نے پھول اگانے میں اتنا کمال حاصل کیا تھا کہ انہوں نے صرف ایک پھول گل لالہ کی آٹھ سو انتالیس (839) قسمیں تیار کیں۔

مسلمان درختوں میں پیوند کاری کے آٹھ طریقوں سے آگاہ تھے۔ تجربہ اور مشاہدہ ان کے رہنما اصول تھے۔ دوسرے علوم کی طرح نباتات کا مشاہدہ بھی درک بینی کے ساتھ کرتے تھے۔ البیرونی کی تیز نگاہی کا اندازہ ان کے اس انکشاف سے ہو سکتا ہے کہ پھول کی پتیاں ہمیشہ 3،4،5،6،18 ہوتی ہیں۔ 7 یا 9 کبھی نہیں ہوتیں۔ نصیر الدین طوسی کھجور کے مادہ پودوں کی باردای کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بسا اوقات کھجور کے پچاس مادہ پودوں کو باردار کرنے کے لئے صرف دو نر پودے کافی ہوتے ہیں۔

مسلمان ماہرین زراعت نے نباتیات کے دور آغاز ہی میں یونانی تصانیف کو پیچھے چھوڑ دیا۔ تیسری صدی ہجری میں ابو حنیفہ الدینوری "کتاب النبات" چھ ضخیم جلدوں میں تصنیف کی جس کی شرح اسپینی عالم ابن اخت غانم الاندلسی نے ساٹھ جلدوں میں تحریر کی۔ جرمن محقق زلبر برک (silberberg) کے بقول یونانیوں نے ہزار سالہ تاریخ اور علم و فضل کے دور عروج میں جو کتابیں نباتیات کے موضع پر لکھی ہیں۔ (مسلم نباتیات کے دور آغاز ہی سے)

ابو حنیفہ الدینوری انہیں بہت پیچھے چھوڑ دیا گیا۔

یونانیوں کی خیالی کائنات پر مسلمانوں نے ہمیشہ عملی دنیا کو ترجیح دی۔ انہوں نے اپنی معلومات سے کام لے کر زراعت اور باغبانی کو ترقی دی۔ کاشتکاری کے نئے طریقے رائج کئے۔ درختوں اور پودوں کی کاشت ان کے نشو و نما کی مدت کے تعین پھلوں کو لگنے والی بیماریوں اور ان کے سد باب پر روشنی ڈالی۔

انہوں نے کھاد کے استعمال کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ ان فصلوں کی نشاندہی کی جن سے زمین کی قوت زرخیزی میں اضافہ یا کمی ہو جاتی ہے۔ نباتیات اور زراعت میں اپنی بے پناہ مہارت سے مسلمانوں نے بنجر زمینوں کو لہلہاتے سبزہ زاروں میں بدل دیا۔

عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کا زرعی نظام سب سے ترقی یافتہ تھا۔ رومی اور بازنطینی جہاں کھیت سے بیس مہینوں میں ایک فصل لیتے تھے۔ مسلمان چار اور چھ فصلیں حاصل کرتے تھے۔ زمین کی اقسام کی جانچ کر کے مسلم ماہرین اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہر قسم کی زمین حتیٰ کہ بنجر اور ریگستانی زمین بھی کسی نہ کسی فصل کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ پیداوار بڑھانے کی خاطر انہوں نے الگ الگ پودوں کے لئے بھیڑ، بکریوں کی مینگنیوں، گھروں کے گندے پانی اور کیچڑ عمارتوں کے پرانے ملبوں، ناکارہ اناج، گلے سڑے پھلوں خون اور ہڈیوں جانوروں کی بیٹ اور سنکھیا چونا ملی ہوئی مٹی وغیرہ سے قسم قسم کی کھادیں تیار کرنے اور انہیں استعمال کرنے کے طریقے معلوم کئے۔ انہوں نے سنگین حوضوں میں کھاد تیار کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ آلات کشاورزی میں ہل پھنگے ہنسیاں اور دیگر آلات استعمال کئے جو اسٹیل سے تیار کئے جاتے تھے۔ محتسب کے فرائض میں یہ ذمہ داری بھی شامل ہوتی تھی کہ وہ لوہاروں کی نگرانی کرے تاکہ وہ آلات میں غیر معیاری قسم کا لوہا استعمال نہ کریں۔

از منہ وسطیٰ کے مسلمانوں نے زراعت کو منظم صنعت کی شکل دی تھی غذائی اجناس پھل پھول اور میوے ایک جگہ سے دوسرے جگہ برآمد کئے جاتے تھے۔ شکر نباتاتی تیل عطر اور عرق گلاب کی صنعتیں انہی کی بدولت وجود میں آئیں اور پھلنے پھولنے لگیں۔ عالم اسلام کے بڑے شہروں میں شکر تیل اور عرق گلاب تیار کرنے ک کارخانے قائم ہوئے۔ عام معیشت کے فروغ کے لئے مسلمانوں نے شہد کی مکھیاں اور مرغیاں پالنے پر خاص توجہ دی۔ مصر میں بڑے بڑے پولٹری فارم کھولے گئے جن میں مصنوعی طور سے انڈوں سے بچے پیدا کئے جاتے تھے۔ انڈوں سے بچے نکالنے کا مصنوعی طریقہ یہاں کے مسلم ماہرینے ایجاد کیا تھا۔ مصر میں انہوں نے سورجکی گرمی کے ذریعے شتر مرغ کے انڈوں سے بھی بچے

نکالنے کا طریقہ دریافت کیا تھا۔اس معاملے میں مصری مسلمانوں کی مہارت کا شہر یورپ تک عام تھا۔

مسلمانوں نے علم زراعت و نباتیات جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں وہ اسپین اور مغرب کے زراعت نظام میں آج بھی نمایاں زراعت سے متعلق چیزوں، نباتات اور میوؤں کے ان گنت نام عربی سے ماخوذ ہیں۔ عربی کے الفاظ الساقیہ، الارز، الرمان اور الزعفران سے بالترتیب اسپینی الفاظ Romania, Arros, Accquia اور Asafron اخذ کئے گئے ہیں۔ الرقوق سے اسقنی لفظ Albariqucqus بنا ہے جس سے انگریزی لفظ Apricot عربی کے الفرسق سے اسپینی Alberchigo اخذ کیا گیا ہے جس سے لاطینی کا Peaches بنا ہے عربی لفظ قطن سے اسپینی Algabin اور انگریزی Cotton بنایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ مغربی زبانوں میں عربی کے جو الفاظ در آئے ہیں ان میں صندل سے Sandal آرنج سے Orange لیلاج سے Lilae زنجبیل سے Geinger خولنجان Calang اور تمر ہندی سے Tamarind ماخوذ ہیں۔

17- علم جغرافیہ

انسان نے جب سے زمین پر سیر و تفریح کا آغاز کیا ہے اسے اس امر سے دلچسپی رہی ہے کہ وہ بعد مسافت کا تعین کرے۔ مختلف علاقوں کے طبعی اختلافات کا جائزہ لے کر کسی بھی جگہ کا محل وقوع و آب و ہوا، پیداوار، پہاڑوں، دریاؤں اور جنگلوں کی تفصیلات سے آگاہ ہوں۔ مسلمانوں میں تسخیر عالم کا شوق حج بیت اللہ کی عظمت و تقدس، جہت قبلہ کے تعین کا لحاظ، فن حدیث و رجال اور عام تحقیقی و مشاہداتی ذوق ایسے امور ہیں، جو مسلمانوں کے رہوار شوق کے لئے ممیز ثابت ہوئے اور انہوں نے دوسرے علوم کی طرح جغرافیہ کو بھی اپنی تحقیقات کی آماجگاہ بنایا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید نے اپنے عہد حکومت میں انہتر سائنس دانوں کو جغرافیاتی تحقیقات اور دنیا کے نقشہ کی ترتیب و تدوین پر مقرر کیا۔ ان کی تحقیقات سے حاصل ہونے والے مواد کی بنیاد پر محمد بن موسی الخوارزمی (236ھ) نے عربی میں جغرافیہ کی پہلی کتاب "صورۃ الأرض" کے نام سے لکھی جس کے ساتھ ایک نقشہ بھی تھا۔ ان کے بعد عہد مامونی میں ڈاک اور پرچہ نویسی کے منتظم نے تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) میں جغرافیہ کے موضوع پر "المسالک والممالک" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، ڈاک کا یہ ناظم جغرافیہ دان ابن خرداذبہ (المتوفی 300ھ)

تھا جسے مسلم جغرافیہ کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ ابن خرداذبہ نے یہ کتاب خلیفہ مامون الرشید کے حکم پر لکھی تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں احمد بن اسحاق ابی یعقوب بن واضح الکاتب الیعقوبی (المتوفی 283ھ) نے "کتاب البلدان" تصنیف کی یعقوبی کے بعد ابن رستہ (المتوفی حدود 310ھ) نے "الاعلاق النفیسة" اور ابن الفقیہ الحمدانی تیسری صدی ہجری/نویں صدی ہجری نے "کتاب البلدان" ہی کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ چوتھی صدی ہجری کے ربع اول میں قدامہ بن جعفر الکاتب (المتوفی 310ھ) نے "کتاب الخراج وصنعة الکتاب" تحریر کی جس میں انہوں نے گیارہویں باب کے ذیل میں راستوں ڈاک کی منزلوں اور سرحدوں کی تفصیل دی ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں مشہور مورخ ابوالحسن علی بن حسین المسعودی نے اپنا سفر نامہ "کتاب القصاوالتجارب" کے نام سے تیار کیا جس میں مصنف نے چشم دید واقعات ومشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر وسیع اور اہم جغرافیائی مواد پیش کیا ان کی دیگر کتابوں "مروج الذهب و معادن الجواہر" اور "التبیه والا اشراف" میں بھی ان کی سیاحت کے حالات ملتے ہیں۔

مسلم جغرافیہ نگاری میں بلخ کے مکتب فکر کو اس لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں اسلامی رنگ نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ یہ مکتب فکر ابو زید احمد بن سہیل بلخی (المتوفی 322ھ) کے نام پر دبستان بلخ کہلاتا ہے۔ آپ نے "صورالاقالیم" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اسے بنیاد بنا کر جغرافیہ دان ابواسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی الاصطخری نے "المسالک والممالک" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں ہر ملک رنگین نقشے میں دکھایا گیا تھا۔ اصطخری کی درخواست پر ابوالقاسم محمد بن حوقل البغدادی (المتوفی 367ھ/977ء) نے ان نقشوں پر نظر ثانی کی اور "صورة الأرض" کے عنوان سے ایک کتاب 366ھ/977ء میں قلم بند کی۔ ابو ریحان محمد ابن احمد البیرونی (440ھ) نے 1030ء میں اپنی شاہکار کتاب "تاریخ الہند" تصنیف کی۔ انہوں نے اس کتاب میں اہم جغرافیائی مواد پیش کیا جو اس سے پہلے کسی دوسری کتاب میں نظر نہیں آتا۔

اندلس میں مشہور جغرافیہ داں ابو عبید عبداللہ بن عبدالعزیز (المتوفی 487ھ) نے "معجم ما استعجم من اسماء البلادوالمواضع" کے نام سے ایک جغرافیائی لغت تیار کی جس میں مختلف شہروں اور جگہوں کے ناموں کی املاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسپین کے اس عظیم جغرافیہ دان نے ایک اور کتاب بھی جغرافیہ کے موضوع پر تصنیف کی جو "کتاب المسالک والممالک" کے نام سے معروف ہے۔

قرون وسطیٰ کے ایک مشہور جغرافیہ دان محمد بن محمد ادریسی (560ھ) تھے انہوں نے اس فن پر اپنی شہرہ آفاق کتاب" نزهة المشتاق في اختراق الآفاق"تحریر کی جسے یورپ کے تعلیمی اداروں میں تین سو سال تک حروف آخر کی حیثیت حاصل رہی۔

زمین کی گولائی سے مسلمان آٹھویں صدی عیسوی میں واقف ہو گئے تھے۔ادریسی نے اسے مان کر اپنے پیش رو ہم مذہبوں کی تصدیق کی۔ جغرافیہ کے بارے میں صحیح مواد فراہم کرنے کے علاوہ ادریسی نے نقشہ کشی کے فن کو معراج کمال تک پہنچایا۔انہوں نے 4511ء میں پوری دنیا کا نقشہ بنایا۔یہ نقشہ چاند کا تھا جس میں کمال مہارت کے ساتھ دنیا کے مال دکھائی گئے تھے نقشے میں پہاڑ دریا جنگل اور وادیاں بھی دکھائی گئی تھیں۔علاوہ ازیں انہوں نے چاندی کا ایک آسمانی کرہ بھی بنایا تھا۔

اسی عہد کے ایک اور جغرافیہ دان یاقوت حموی نے سیاحت کے دوران اپنے مشاہدے اور مطالعے کے ذریعے حاصل کئے گئے جغرافیائی مواد اور دوسری معلومات کو اپنی کتاب"معجم البلدان" میں قلم بند کیا۔ان کی یہ کتاب Lestrange کے الفاظ میں جغرافیائی معلومات کا خزانہ ہے جس کی قدر و قیمت کا جتنا زیادہ اندازہ لگایا جائے اس میں کسی مبالغے کا امکان نہیں ہو گا۔

زمین کی ہیئت کے بارے میں قدیم اور مشہور عام نظریہ یہ تھا کہ زمین چپٹی ہے۔اہل یورپ اپنے محدود علم کے مطابق نشاۃ ثانیہ تک زمین کو چپٹی مانتے تھے۔ مگر مسلمان صرف پچاس برس کے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچے کہ زمین گول ہے۔اسی اساس پر انہوں نے جغرافیہ میں اپنے تحقیقاتی عمل کی ابتداء کی۔ مامون الرشید نے اپنے ریاضی دانوں اور ماہرین ہیئت کو حکم دیا تھا کہ وہ زمین کا سائز اور محیط متعین کریں۔ چنانچہ خط نصف النہار کے ایک قوس کی پیائش کی گئی۔اس کے نتیجے میں ایک درجے کی لمبائی 56 3/2 میل قرار پائی جو غیر معمولی حد تک درست ہے۔ مسلم سائنسدانوں کے تخمینے اور آج کے تخمینے میں صرف آدھ میل بلکہ ڈریپر کے بیان کے مطابق صرف ایک تہائی میل کا فرق ہے۔

مسلم سائنسدانوں نے شاہی فرمان کے مطابق دو مرتبہ زمین کی پیائش کی۔ان کی دریافت کے مطابق زمین کا قطر سات اور آٹھ ہزار میل کے درمیان نکلا۔زمین کا جو محیط معلوم کیا گیا اس میں اور آج کے محیط میں صرف 151 میل کا فرق ہے۔

جغرافیہ میں مسلمانوں نے شہروں کے محل وقوع کے تعین میں عرض بلد اور طول بلد سے کام لینے کی روایت قائم کی۔

البیرونی نے ہندوستان کے مختلف شہروں سے محل وقوع کا تعین کرتے وقت ان کے عرض بلد اور طول بلد میں بھی دریافت کئے ان میں سے گیارہ شہروں کے عرض بلند اور طول بلد آج بھی درست اور صحیح ہیں۔ ساتویں صدی

ہجری میں ابن سعد (652ھ) نے "كتاب الجغرافيه فی الاقاليم السبعة" میں مشہور شہروں اور مقامات کا محل وقوع بیان کیا ان کے بیان کئے ہوئے طول بلد اور عرض بلد آج بڑی دیر تک درست ہیں ان کے بعد ابو الفداء نے "تقويم البلدان" میں بہت سے مقامات کا طول بلد اور عرض بلد دیا ہے جو درستی اور صحت کی بنا پر قابل داد کارنامہ ہے۔ مغرب میں ابو الحسن افریقی نے بطلیموس کے جغرافیہ کی اصلاح کے لئے افریقہ کے چوالیس شہروں کا عرض بلد معلوم کیا۔

مسلم سائنسدانوں نے بطلیموس کی غلطیوں کی تصحیح کر کے علم جغرافیہ کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ بطلیموس نے بحر متوسط کی لمبائی 19 زیادہ قرار دی تھی جس سے اصل لمبائی میں چار سو فرسخ کی غلطی واقع ہو گئی تھی مسلمانوں نے اسے درست کر کے جو لمبائی دریافت کی وہ تقریباً اصل تخمینے کے برابر ہے۔

خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر 1: علم کیمیا میں مسلمان سائنسدانوں کی خدمات کا جائزہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر 2: علم طبیعات میں ابن سینا، ابو بکر رازی، اور ابن الہیثم کے کارناموں کو واضح کیجیے۔

سوال نمبر 3: قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی صنعتی ترقی پر تفصیل سے تبصرہ کیجیے۔

سوال نمبر 4: زراعت کی ترقی کے لئے مسلمان سائنسدانوں نے کون سے علمی کارنامے سر انجام دیے؟